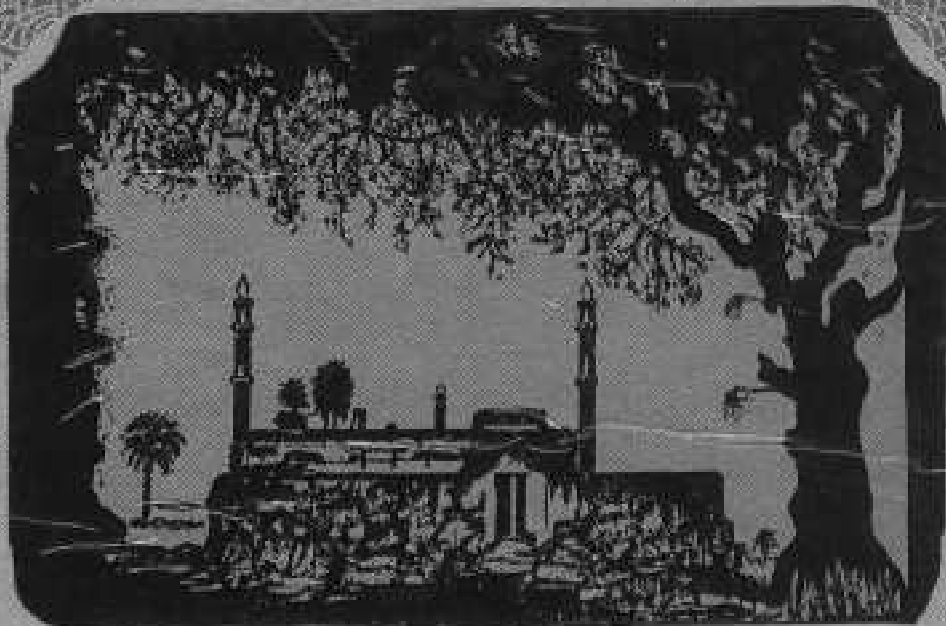


وہ جو شاعری کا سبب ہوا......



طوبیٰ پبلیکیشنز حیدرآباد

وہ جو شاعری کا سبب ہوا

کلیم عاجز

ناشر

طوبیٰ پبلیکیشنز حیدرآباد

نام کتاب : .... وہ جو شاعری کا سبب ہوا
نام مصنف : .... کلیم عاجز
کتابت : .... عبدالرحمٰن صوفی، و محمد اختر
سرورق : .... محمد اختر
طبع سوم : (ترتیب نو اور اضافہ کے بعد) .... اکتوبر ۱۹۹۶ء
قیمت : ....

ناشر : طوبیٰ پبلیکیشنز حیدرآباد (الہند)

TUBA PUBLICATIONS
HYDERABAD - INDIA

ملنے کے پتے :

Drululoom Sabeelussalam
Sabeel Nagar, Balapur, Behind Salalah, Barkas,
Hyderabad - 500 005 A.P. (India)
Phone: 239450

حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد۔ PH : 522385

ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، حیدرآباد PH : 523011

قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، و ٹیچ بلڈنگ حضرت نظام الدین ویسٹ نئی دہلی
PH : 4617240

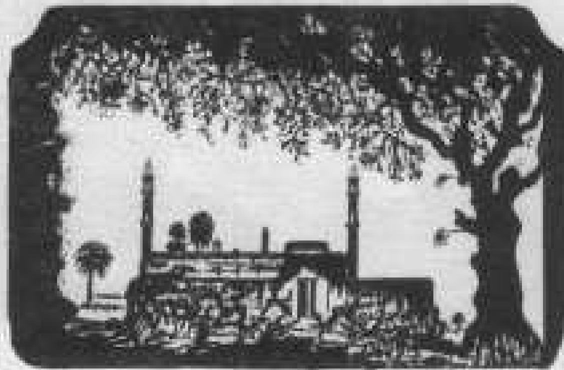
انتساب

اپنی والدہ محترمہ کے نام

جن کی شہادت کا غم

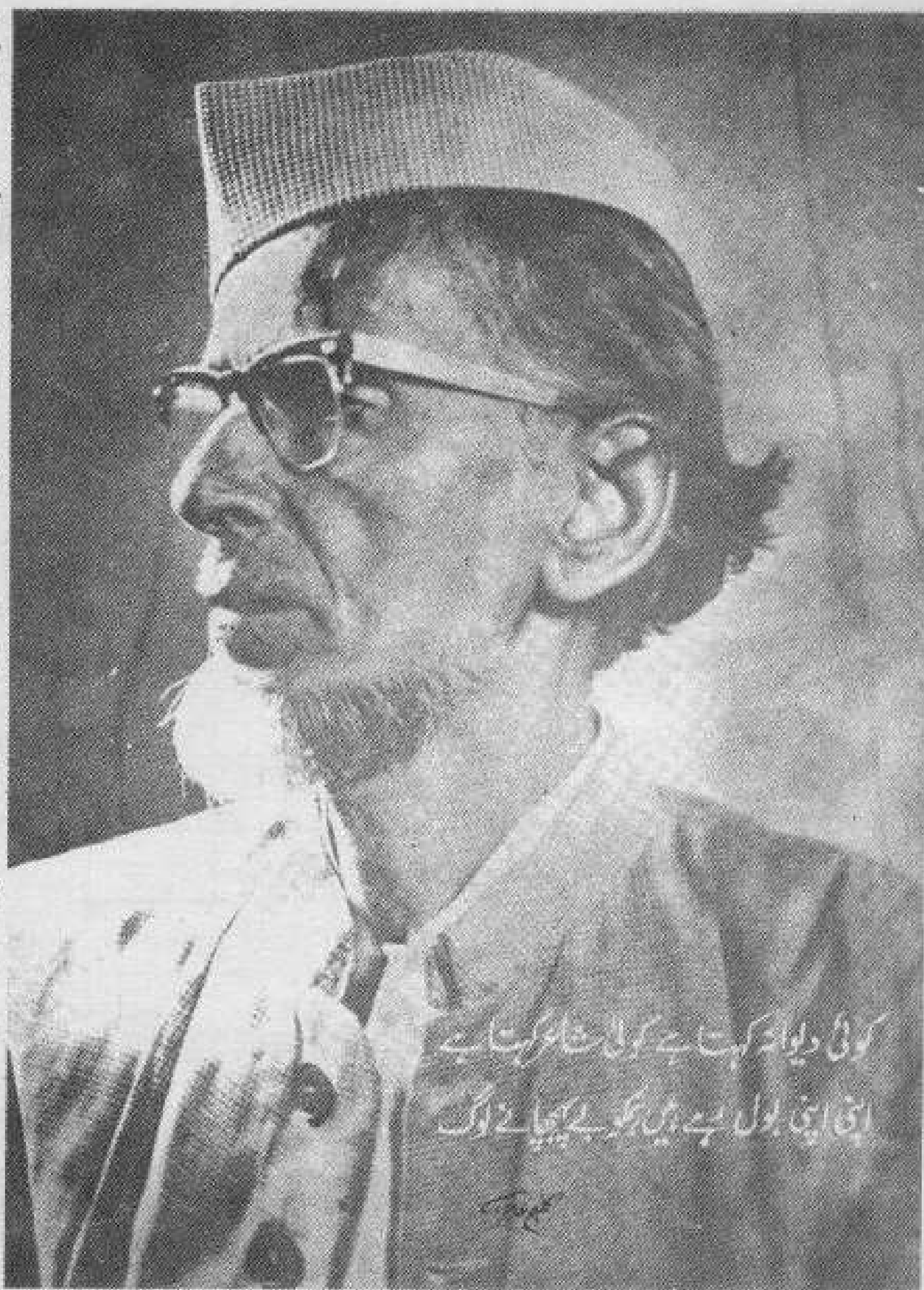
میرا سرمایۂ حیات ہے

کلیم عاجز



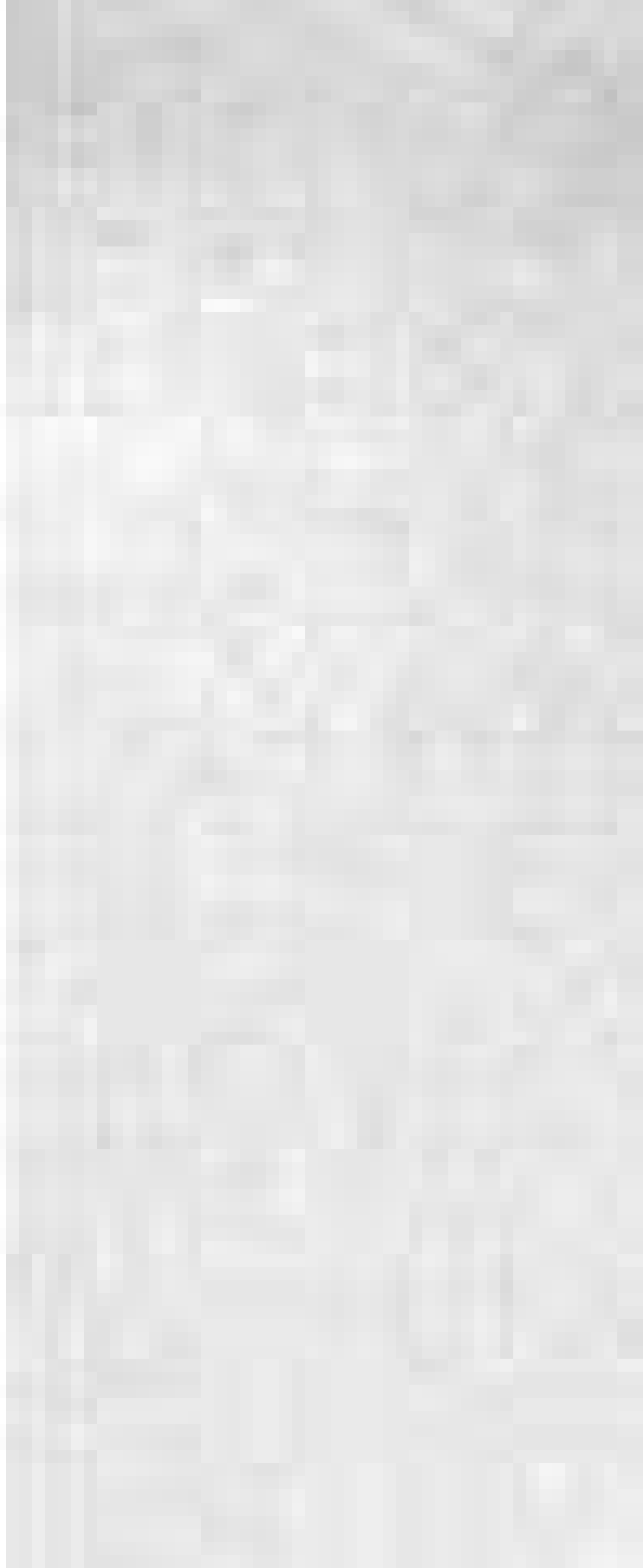
"وہ جو شاعری کا سبب ہُوا وہ معاملہ بھی عجب ہُوا
میں غزل سُناؤں ہوں اِسلئے کہ زمانہ اُس کو بھلا نہ دے"

کلیم عاجز


کوئی دیوانہ کہتا ہے کوئی شاعر کہتا ہے

فہرست





عرضِ ناشر

ہمارے لئے باعث مسرت ہے کہ عصر حاضر کے میر جناب کلیم عاجزؔ کا مجموعۂ کلام جو عرصہ سے نایاب تھا اور شوق کی نگاہیں جن کی دید کے لئے تشنہ کام تھیں "طوبیٰ پبلیکیشنز" اس کو قارئین کی نذر کر رہا ہے، آج کل شعر و سخن بہت سوں کے لئے تفریح قلب و ذہن کا مشغلہ ہے اور بہتوں کے لئے کسب معاش کا ذریعہ ہے، لیکن کلیمؔ صاحب کا کلام درد دل کا ترجمان ہے، یہاں انسانیت کا غم ہے، دکھ ہے، درد ہے، محبت ہے، سوز دروں ہے، کسک اور چوٹ اور اس سے بجنے والا ساز ہے، نہ تصنّع ہے نہ آورد ہے، نہ عشق کی مصنوعی دیوانگی ہے، جو کچھ ہے وہ آپ بیتی ہے، اس نے کلیمؔ صاحب کی شاعری کو "شاعری" سے بڑھ کر "ساحری" بنا دیا ہے۔

بقول کنہیا لال کپور:

"وہ جب کبھی نغمہ سرا ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی بسیط و عریض ویرانے میں کوئی زخمی فرشتہ فریاد کر رہا ہے، اور سسکیاں بھر رہا ہے۔"

کلیم صاحب کے ہم نام اور ہم وطن مشہور نقاد کلیم الدین احمد کی شمشیر تنقید سے شاید ہی کوئی شاعر اور ادیب ہو جو گھائل نہ ہوا ہو اور ان کی بارگاہ نقد سے بے آبرو ہو کر نکلنے سے محفوظ رہا ہو لیکن کلیم صاحب نے اپنے آپ کو اس نقاد بے رحم سے بھی بہت کچھ منوا لیا ہے، کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

"ان کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی، اور سیاسی باتیں غزل کی زبان میں ہیں ان کے شعروں میں پھول بھی ہیں اور پتھر بھی، اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں، اس کام کے لئے بھی سلیقہ کی ضرورت ہے۔"

کلیم عاجز صاحب کے درد و سوز نے ان کے اشعار اور ان کے تغزل کو ایک خاص پہچان اور شناخت عطا کی ہے، جمیل مظہری کے بقول:

"انداز فکر میں جدت اور انداز بیان میں قدامت کلیم عاجز کے تغزل کا مخصوص آرٹ ہے جو سیکڑوں شعراء کے ہزاروں اشعار کے ہجوم میں جانا اور پہچانا جا سکتا ہے۔"

لوگ غم سے دوچار ہوتے ہیں، کلیم صاحب نے اس سے دوچار ہو کر وادئ غم سے گزرنے کی بجائے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

جہاں غم ملا اٹھایا، پھر اسے غزل میں ڈھالا — یہی درد سر خریدا، یہی روگ ہم نے پالا

غم جاناں اور غم دوراں کا تسلسل کتنی مشکل چیز ہے، کلیم صاحب نے اس کا خوب نقشہ کھینچا ہے:

سلگنا اور شمع ہے جل کے مر جانے سے کیا ہوگا   جو ہم سے ہو رہا ہے کام پروانے سے کیا ہوگا

یہی سلگنا اور گھلنا کلیم صاحب کا امتیاز ہے ___ کلیم صاحب نے اپنے اشعار میں بہت کچھ کہا ہے' سیاست کو چھیڑا ہے' اخلاقی گراوٹ پر نقد کیا ہے' بے مروتی اور جور و جفا کے شکوے بھی کئے ہیں' ظلم اور جور کو آئینہ بھی دکھایا ہے' محبت کی تعلیم بھی دی ہے' ادیبوں اور شاعروں کو حقیقت پسندی اور غم انسانیت کو بانٹنے کی تلقین بھی کی ہے' لیکن ہر جگہ کلیم کی زبان درد کی زبان بن کر کھلتی ہے' اور بات جو بھی ہو کمال سلیقہ کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ :

بات گرچہ بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

کلیم صاحب کے ایک سے زیادہ مجموعہ ہائے کلام ہند و پاک سے طبع ہو چکے ہیں' اور ان کی نے اہل ذوق اور اہلِ زبان سے خوب داد حاصل کی ہے' یہاں تک کہ فراق گورکھپوری جیسے فرمانروائے اقلیم ادب بھی ایک انوکھے اور نرالے انداز میں کہہ پڑے کہ :

"ان کا کلام مجھے اتنا پسند آیا کہ مجھے تکلیف سی ہونے لگی اور کلیم صاحب پر غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں اتنا اچھا کہتے ہیں' ان کے اس جرم اور قصور کے لئے میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا' اتنی دھلی ہوئی زبان' یہ گھلاوٹ' لب و لہجہ کا یہ جادو جو صرف انتہائے خلوص سے پیدا ہو سکتا ہے' اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا' میں ان کا کلام سن کر خود اپنا کلام بھول گیا"

کلیم صاحب کا پہلا مجموعہ کلام "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" جنوری ۱۹۷۶ء میں بزم کاف پٹنہ سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا تھا' اس وقت تک شاید ہی کسی شاعر کا کلام اس قدر بہتر طور پر طبع ہوا ہو' پھر اس کا دوسرا ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آیا' اب عرصہ سے یہ مجموعہ کلام ہندوستان میں نایاب تھا اور اہل ذوق اس کے لئے

بے چین تھے۔ رفیق محترم مولانا عبدالمتین منیری بعض امور میں جناب کلیم عاجز سے مراسلت کر رہے تھے اس مراسلت میں اس کتاب کی طباعت کا مسئلہ بھی آیا' راقم سطور نے سعادت سمجھ کر اس کے لئے پیش کش کی' منیری صاحب نے بھی اس پر خوشنودی کا اظہار کیا' اور خود محترم جناب کلیم عاجز نے بھی اس پر پسندیدگی ظاہر فرمائی' پھر برادر محترم حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب نے اس توجہ اور مشورہ کو نہ صرف مزید تقویت پہنچائی بلکہ اسکی ترتیب نو اضافی حصہ کی کتابت اور طباعت و اشاعت کے مشکل مراحل میں خود بنفس نفیس اور دارالعلوم سبیل السلام کے ممتاز اساتذہ کے ذریعہ عملی تعاون فرمایا' جن میں عزیز مکرم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (صدر مدرس) شامل ہیں۔ اور اس طرح میں نے اللہ کا نام لے کر اس اہم ادبی خزانہ کو قارئین تک پہنچانے کی ہمت کی۔

"طوبیٰ پبلیکیشنز" جس کا مقصد تعمیری اور فکر انگیز ادب کو فروغ دینا اور ایسی کتابوں کی اشاعت کا نظم کرنا ہے' زیر نظر کتاب اس ادارہ سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے' ہم بزرگ شاعر محترم ڈاکٹر کلیم عاجز کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے اس عظیم ادبی سرمایہ کی اشاعت کے لئے اجازت مرحمت فرمائی۔

فجزاہ اللہ خیر الجزاء

امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت ادارہ کے لئے حسن آغاز اور فال نیک ثابت ہوگی اور اہل ذوق اسے شوق کے ہاتھوں لے کر قدر کی نگاہوں سے پڑھیں گے۔

محمد سلمان صدیقی
کنگ کوٹھی' حیدر آباد
(بحال مقیم دبئی)

۱۰ / ۶ / ۱۴۱۷ھ
م ۲۴ / ۱۰ / ۱۹۹۶ء

تبصرہ



کلیم الدین احمد

پروفیسر کلیم الدین احمد۔ ماہر تعلیم، نقاد اور محقق۔ پیدائش ستمبر ۱۹۰۸ء۔ صدر شعبۂ انگریزی پٹنہ یونیورسٹی، پرنسپل پٹنہ کالج، ڈین فیکلٹی آف آرٹس پٹنہ یونیورسٹی، ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بہار، ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل لائبریری، چیرمین اسکول اکزامنیشن بورڈ بہار۔ ڈائرکٹر انگریزی اردو ڈکشنری ترقی اردو بورڈ (ہند)۔

اردو شاعری کی تنقید کی دنیا میں، جو بت خانۂ آذر تھی، بت شکن مشہور ہیں۔ ان کی تصنیفات اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، فن داستان گوئی، عملی تنقید وغیرہ وغیرہ تنقید اور تحقیق کی دنیا میں اب تک حرف آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں مرکزی حکومت ہند کے عطیۂ غالب ایوارڈ کو ہم قدر شناسی کی ابتدا کہہ سکتے ہیں۔



غزل سے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے اُردو دُنیا واقف ہے۔ اس لئے اس کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ لیکن کچھ احباب سمجھنے لگے ہیں کہ میرے خیالات میں تبدیلی ہوئی ہے ـــــ سُرورؔ صاحب کہتے ہیں: "ان کی مخالفت میں اگلی سی شدّت نہیں ہے"۔ اور کلیم عاجزؔ بھی اسی غلط فہمی میں مُبتلا ہیں۔ لکھتے ہیں: "وہ یہ سمجھتے ہیں کہ غزل کے جس ہیئتی نقص نے نیم وحشی صنفِ شاعری کا فتویٰ ان سے دِلوایا ہے عہدِ حاضر میں وہ بہت حد تک اپنی اصلاح کر چکی ہے۔ مگر جب بات زبان سے نکل گئی ہے تو وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے والا معاملہ در پیش ہے ـــــ" اس لئے میں یہ بات صاف کر دوں کہ میری رائے جو تھی وہ ہے۔

مشکل یہ ہے کہ غزل کی وجہ سے جو ریزہ خیالی آ گئی ہے وہ تنقید کے لئے مضر ہے۔ جس طرح غزل کے ایک شعر یا ایک مصرع پر واہ! واہ! ہوتی ہے، اسی طرح تنقید کے کسی ایک جملے یا ایک مختصر ٹکڑے پر توجہ مرکوز ہو جاتی ہے، اور صرف اسی کی تعریف ہوتی ہے یا اس کے خلاف شدید ردِّ عمل ہوتا ہے۔ اب یہ کون کہے کہ تنقید غزل تو ہے نہیں کہ اس کے ایک جُملے کو حاصلِ تنقید

سمجھ لیا جائے ۔ تنقید بھی شعر کی طرح ایک اکائی ہے لیکن کچھ پیچیدہ قسم کی اور اس کے اجزا کو الگ نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ میں نے جہاں غزل کے صنفی نقائص کا مفصل تجزیہ کیا ہے ، وہاں اس کے امکانات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے ۔ میں نے کہا ہے کہ غزل نظم بن سکتی ہے ، غزل قطعہ بند ہو سکتی ہے ، غزل مسلسل ہو سکتی ہے ۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ غزل میں خیالات و جذبات ایک مرکز کے گرد چکّر کھاتے ہیں ۔ اور میں نے یہ بھی کہا کہ بعض شعرا ایسے بھی ہیں جن کے خیالات ایک نہج پر بہتے ہیں اس لئے ان کی غزلوں میں انمل اور بے جوڑ باتیں نہیں ہوتی ہیں یا کم ہوتی ہیں ۔

کلیم عاجز کی غزل میں نے پہلی بار پڑھی نہیں بلکہ سُنی ۔ ان کی آواز مترنم ہے اور پڑھنے کا ڈھنگ دلکش ہے ۔ عموماً مجھے یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ مشاعرہ میں شاعر گویّا بن جائے اور تعریف شعر کی نہ ہو بلکہ ترنم کی ہو ۔ شعر میں شاعر کا خونِ جگر صرف ہوتا ہے ۔ شعر دماغ سوزی کا کام ہے اور اسے سمجھنے ، اس سے پُورا پُورا لطف حاصل کرنے کے لئے سامعین کو بھی غور و فکر ، دماغ سوزی سے کام لینا ہوتا ہے اور ترنّم اس میں حائل ہوتا ہے ، لیکن کلیم عاجز کے شعروں کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے شعروں میں ایک مخصوص سادگی ہے ۔ ان کے الفاظ جانے پہچانے ، ان کی ترکیبیں ایسی سیدھی سادھی ہوتی ہیں کہ مفہوم فوراً ذہن نشیں ہو جاتا ہے ۔ یہ نہیں کہ ان کے اشعار سطحی ہوتے ہیں بلکہ الفاظ اور ترکیبوں اور معانی کے درمیان کوئی پردہ نہیں بلکہ یوں کہئے کہ ان کے الفاظ ایسے شفاف ہیں کہ معانی کو ایک نگاہِ غلط انداز

بھی پالیتی ہے۔ اکثر ان کے شعروں میں لفظوں کا ایک تو سطحی مفہوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا مفہوم بھی ہوتا ہے، دونوں بیک وقت سمجھ میں آجاتے ہیں۔

مبارک عظیم آبادی کا ایک شعر ہے:

جو دل پہ گزرے کھنچے اس کی صفحہ پر تصویر

قلم اُٹھے نہ مبارک خیال بندی پر

کلیم عاجز کا بھی یہی مسلک ہے کہ 'جو دل پہ گزرے کھنچے اس کی صفحہ پر تصویر'۔ ان کے شعروں میں 'غمِ جاناں' بھی ہے اور 'غمِ دوراں' بھی۔ اور وہ 'غمِ جاناں' کو 'غمِ دوراں' بناتے ہیں اور دونوں اس طرح گھُل مل جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جاسکتے ہیں۔ وہ ہونے والے واقعات کی طرف کھُلے یا چھُپے اشارے، طنزیہ اشارے کرتے ہیں جو فوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ ہونے والے واقعات ہوں یا نجی واقعات ہوں، ان کے شعروں میں ایک قسم کا تسلسل پیدا کر دیتے ہیں:

میری شاعری میں نہ رقص جام نہ مئے کی رنگ فشانیاں

وہی دُکھ بھروں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں

یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں

یہی میرے دن کے رفیق ہیں، یہی میری رات کی رانیاں

کبھی آنسوؤں کو سُکھا گییں میرے سوزِ دل کی حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گییں میرے آنسوؤں کی روانیاں

ان کی غزلوں میں 'دُکھ بھروں کی حکایتیں' اور 'دل جلوں کی کہانیاں' ہیں۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں انمل اور بے جوڑ باتیں نہ آنے پائیں۔ اگر وہ تسلسل کی فنّی ضرورت اور اہمیت کو سمجھیں تو وہ مسلسل غزلیں لکھ سکتے ہیں اور ان کی غزل دُکھ بھروں کی 'حکایت' اور دل جلوں کی 'کہانی' بن سکتی ہے۔ 'حُسن خیال' اور 'حُسن تنظیم' میں کوئی بیر نہیں ہے۔ 'سادگی و پرکاری'، 'بیخودی و ہشیاری' صرف شاعری ہی نہیں فن کا اہم نکتہ بھی ہے۔ اور کلیم عاجزؔ اس نکتہ سے واقف ہیں لیکن وہ اس سے گریز کرتے ہیں۔ کہتے ہیں :

مانگنا جُرم ہے فنکار سے ترتیب خیال
گیسوئے وقت جب آشفتہ بیانی مانگے

ذاکر صاحب کہتے تھے کہ غلام ربّانی تاباںؔ نے اپنی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا تو اس میں ایک مقدمہ بھی تھا جس میں انہوں نے غزل کی حمایت کی تھی۔ میں نے کہا بھئی غزلیں کہتے ہو تو کہو، لیکن غزل کی حمایت کیوں کرتے ہو۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارے دل میں چور ہے۔ : 'کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے'۔ گیسوئے وقت آشفتہ بیانی مانگے یا نہ مانگے، 'ترتیب خیال' فنکار کا فن ہے۔ کلیم عاجزؔ خود بھی یہی کہتے ہیں :

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیمؔ　　　بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

اور کلیم عاجزؔ کو بات کہنے کا سلیقہ ہے اور ان کی غزلوں میں ترتیب خیال بھی ہے ۔ وہ ترتیب خیال تو نہیں جو قطعہ بند غزل یا مسلسل غزل میں ہوتا ہے، لیکن ان کے جذبات وخیالات ایک ہی نہج پر بہتے ہیں، اس لئے شعروں میں تسلسل سا پیدا ہو جاتا ہے :

تجھے سنگدل یہ پتہ ہے کیا کہ دکھے دلوں کی صدا ہے کیا
کبھی چوٹ تونے بھی کھائی ہے کبھی تیرا دل بھی دکھا ہے کیا ؟

تو رئیس شہر ستمگراں میں گدائے کوچۂ عاشقاں
تو امیر ہے تو بتا مجھے میں غریب ہوں تو برا ہے کیا

تو جفا میں مست ہے روز وشب میں کفن بدوش غزل بلب
تیرے رعب حسن سے چپ ہیں سب میں بھی چپ ہوں تو مزا ہے کیا

یہ کہاں سے آئی ہے سرخ رو ہے ہر ایک جھونکا لہو لہو
کٹی جس میں گردن آرزو یہ اسی چمن کی ہوا ہے کیا

اور دیکھئے :

بڑی طلب تھی بڑا انتظار دیکھو تو　　　بہار لائی ہے کیسی بہار دیکھو تو
یہ کیا ہوا کہ سلامت نہیں کوئی دامن　　　چمن میں پھول کھلے ہیں کہ خار دیکھو تو

لہو دلوں کا چراغوں میں کل بھی جلتا تھا — اور آج بھی ہے وہی کاروبار دیکھو تو

یہاں لہو ہر اک رسن و دار ہی دکھاتا ہے — عجیب شہر عجب شہریار دیکھو تو

نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ — دراز دستیٔ گیسوئے یار دیکھو تو

کسی سے پیار نہیں پھر بھی پیار ہے سب سے — وہ مست حُسن ہے کیا ہوشیار دیکھو تو

ان کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی، اور سیاسی باتیں غزل کی زبان میں ہیں۔ ان کے شعروں میں 'پھول' بھی ہیں اور 'پتھر' بھی۔ اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں۔ اس کام کے لئے بھی سلیقے کی ضرورت ہے۔ اور وہ 'پابندیوں کا غم' لیں تو سلیقہ کی لَو اور تیز ہو سکتی ہے:

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے ہوں ہنر چاہیے



تجزیہ



جمیل مظہری

علامہ سید کاظم علی جمیل مظہری۔ غالب اوارڈ یافتہ عہدِ حاضر کے اہم ترین فلسفی شاعر۔ پیدائش مغل پورہ، پٹنہ ۱۹۰۵ء۔ پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی۔ سابق ڈپٹی ڈائرکٹر شعبۂ نشر و اشاعت حکومتِ بہار۔ حال کے اعتبار سے مجسّم فکر و فلسفہ۔ قال کے اعتبار سے پیکرِ شعریت اور کلام میں تینوں کا حسین امتزاج۔ ہر صنفِ سخن پر یکساں قدرت و مہارت۔ چھوٹی بڑی مطبوعہ نظموں اور ایک طویل مطبوعہ مثنوی "آب و سراب" کے علاوہ دو شعری مجموعے نقشِ جمیل اور فکرِ جمیل منظرِ عام پر آچکے ہیں۔



دبستانِ بہار میں اور خصوصیت کے ساتھ دبستانِ بہار کے شہر عظیم آباد میں بہتر سے بہتر غزل گو شعرا پیدا ہوئے جو اپنے طرزِ خاص کے لحاظ سے خود ایک امامِ فن تھے۔ راسخ کے بعد شاد کا نام خود بخود ذہن میں آتا ہے جن کو امامِ فن کہنا شاید اُن کی توہین ہو، اُنہیں پیغمبرِ فن کہئے یا میر و غالب و انیس کی طرح خدائے سخن کہئے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس خدائے سخن نے اپنے تغزل کے کسی دور میں میر کی پیروی نہیں کی۔ صوفی شاعر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے درد کے مدرسۂ فکر و فن کو پھر سے زندہ کیا۔ ابتدائے مشق میں انہوں نے آتش کے نقشِ قدم پر قدم رکھے تھے۔ سوز و گداز تغزل کے اعتبار سے کہیں کہیں درد کا لہجہ میر سے مشابہ ہو جاتا ہے، لیکن ایسی مشابہت کی مثال بھی شاد کے دیوان میں نہیں ملتی۔ اُن کے یہاں تغزل اور تفلسف کا جو امتزاج شیریں ملتا ہے وہ اُن کا اپنا ہے، اس میں کوئی اُن کا شریک نہیں۔ شاد کہیں کہیں غالب سے مشابہ نظر آتے ہیں، لیکن میر کے مزاج تغزل کے منفعلانہ رجحان کی پرچھائیوں سے ان کے دیوان کے صفحات خالی ہیں۔

ان کے دوسرے ہم عصر علامہ آزاد نے غالب کے فکر و فن کی پیروی کی اور اس پیروی میں وہ اقبال و وحشت کے ہم نوا رہے، میر کی پیروی کا کیا سوال ؟ ہاں ان کے تیسرے ہمعصر اختر عظیم آبادی میر کی پیروی میں کوشاں رہے اور اس کوشش میں انہیں کہیں کہیں غیر معمولی کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن ان کا فلسفیانہ اور مفکرانہ ذہن اپنی ہمہ گیری کے لحاظ سے اتنا مضطرب رہا کہ وہ اپنی تصنیفات اور تخلیقات اور شاعری میں کسی ایک موضوع یا کسی ایک صنف نظم و نثر پر جم کر اپنا پورا زورِ طبع صرف نہ کر سکے۔ ان کا دیوان اُٹھا کر دیکھئے، کہیں وہ سودا، کہیں مومن کے ہم نوا نظر آتے ہیں، کہیں مصحفی اور آتش کے۔ اس لئے مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ میر کی پیروی پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ ان سے بھی نہ ہو سکی۔ ان کے بعد عظیم آباد کے چوتھے غزل گو مبارک عظیم آبادی تھے جنھوں نے داغ کے شاگرد رشید اور شاد کے ہم عصر ہونے کی حیثیت سے دونوں کے رنگِ سخن کو سمو کر غزلیت کی ایک نئی راہ نکالی، جس کی زبان میں آتش کی قلندرانہ سرمستی، داغ کی شوخی اور شاد کی گمبھیرتا ہے۔ لیکن میر کے رنگِ سخن میں ڈوبا ہوا ایک شعر بھی ان کے مجموعہ کلام میں شاید نہ ملے۔ ان کے بعد شاد کے مایۂ ناز شاگردوں میں لاڈلے صاحب بیتاب، موج اور علی باقر آباد اپنی اپنی جگہ امامِ فن تھے۔ لیکن میر کی باضابطہ پیروی کا رنگ ان کے مجموعۂ کلام میں بھی نہیں ملتا۔

ان بزرگوں کے بعد بہار کیا سارے ہندوستان میں غالب، اقبال اور وحشت کی

پیروی کا دَور آتا ہے، جس نے بہارِ جدید کو اجتبیٰ رضوی اور پرویز جیسے عظیم فنکار دیئے۔ لیکن اِن کے ذہنوں کے سانچے کچھ ایسے غیر منفعلانہ تھے کہ میرؔ کے رنگ کے اشعار اِن سے بھی نہ ڈھل سکے۔ غرض اس پوری روداد کا خلاصہ بلکہ نتیجہ یہ ہے کہ بہار کے کسی چھوٹے بڑے شاعر سے میرؔ کی تتبع کا حق ادا نہ ہوسکا اور میرؔ کی میراثِ سخن غالبؔ کی زبان سے چیختی رہی کہ :

'کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق'

لیکن ایک مردِ میدان بھی اس کو اُٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ انجم مان پوری نے دو چار غزلیں میرؔ کے انداز میں کہیں، لیکن ظرافت نگاری نے انہیں ایسی المیہ نگاری کی فرصت نہ دی۔

میرؔ کی عدم پیروی کے سوال کو بہار ہی تک کیوں محدود رکھا جائے۔ بہار سے باہر ہندوستان میں کون ایسا شاعر ہے جسے ہم باضابطہ پیروِ میرؔ کہہ سکتے ہیں ؟ شادؔ لکھنوی اپنے نام کے ساتھ پیروِ میرؔ لکھا کرتے تھے لیکن ان کا ایک شعر بھی میرؔ کے رنگ کا زبان زدِ خلائق نہ ہوسکا۔ لکھنؤ کے دوسرے بڑے شاعر جعفر علی خاں اثرؔ نے میرؔ کے تتبع میں بڑا زور صرف کیا لیکن بقولِ ذوقؔ :

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

میرؔ کی یہ میراثِ خاص تو خالقِ نطق نے ایک ایسے نوجوان کے لئے وقف کر رکھی تھی جو اپنی افتادِ طبع ہی کے لحاظ سے نہیں، میرؔ کی خانگی معاشرتی سماجی اور ان کے عہد کے سیاسی حالات کی مشابہت کے اعتبار سے بھی میرؔ کے تاثراتِ تغزل کا حامل ہونے والا تھا۔

کلیم عاجز گرچہ چار سال میرے اسٹوڈنٹ پٹنہ یونیورسٹی میں رہے، مگر اس زمانۂ طالب العلمی سے قبل پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں منگل تالاب کے ایک محفلِ سخن میں دیکھا تھا، جہاں نواسنجانِ عظیم آباد اپنی نواسنجی سے بزم کو گرمیٔ سخن بخش رہے تھے کہ دفعتاً ان کے ہجوم سے ایک سہمے سہمے نوجوان نے بڑے سہمے سہمے انداز میں غزل سرائی شروع کی اور میرے کان کھڑے ہوگئے کہ میر کی یہ آواز عظیم آباد کے ایک نوجوان کے گلے سے کیسے نکل رہی ہے اور اس کی نوجوانی نے میر کے بڑھاپے کو کیسے اپنے اندر بھر لیا ہے۔

کلیم عاجز اپنی کیفیات تغزل میں میر کے فرماں بردار پیرو تو ہیں، لیکن یہ نہ سمجھے کہ انکے دائرۂ فکر وفن میں میر کی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہمیں ان کی غزلوں میں تغزل جدید کا پرتو بھی ملتا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں نہ سہی، ان کے اندازِ فکر میں بھرپور ندرت اور بھرپور جدت ہے۔ اندازِ فکر میں جدت اور اندازِ بیان میں قدامت کلیم عاجز کے تغزل کا مخصوص آرٹ ہے جو سینکڑوں شعراء کے ہزاروں اشعار کے ہجوم میں جانا اور پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کے عہد کے سماجی اور سیاسی تصورات بڑے سلیقۂ فن کے ساتھ اپنے کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ اپنی جگہ حرف بحرف صحیح ہے:

"تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دینگے"

انھوں نے بلا شبہ غمِ زمانہ ہو یا غمِ روزگار، غمِ وطن ہو یا غمِ کائنات سب کو تغزل کا نازک

شبنمی پیرایۂ لطیف دیا ہے جس میں غزل کی فنی نزاکت کا اس طرح احترام ملحوظ رکھا ہے کہ بے ساختہ عرفی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

سلسلۂ بیان میں عاجز کا ایک مصرع جب قلم کی زبان سے ٹپک ہی پڑا تو آئیے اس غزل کے تین مطلعے آپ کو سنا کر خود بھی محظوظ ہوں اور آپ کو بھی محظوظ کروں :

حقیقتوں کا جلال دینگے صداقتوں کا کمال دینگے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دینگے

نہ بندۂ عقل و ہوش دینگے نہ اہل فکر و خیال دینگے
تمھاری زلفوں کو جو درازی تمھارے آشفتہ حال دینگے

یہ عقل والے اسی طرح سے ہمیں فریبِ کمال دینگے
جنوں کے دامن سے پھول چن کر خرد کے دامن میں ڈال دینگے

آپ کہیں گے کہ اِن تینوں مطلعوں کے اندر جدیدیت کا آہنگ ہے۔ ٹھیک ہے، لیکن ان کی تہہ میں ذرا اُتر کر دیکھیے تو میر کی رُوحِ تغزل ان میں بھی کارفرما نظر آئے گی۔ اب رہی جدّتِ اسالیب کی بات۔ تو کلیم عاجز کل تک نوجوان ہی تھے، بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد جوش کی

رہنمائی میں اُردو شاعری نے جو اسلوب بدلا اور جدیدیت کے نئے امکانات سامنے آئے اُن سے ان کا کچھ نہ کچھ متاثر ہونا لازمی تھا۔ لیکن دوسرے نوجوان شعرا نے صرف اندازِ بیان میں جدّت پیدا کی، لیکن کلیم عاجز کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ترکیبِ خیال میں بھی ندرت آفرینی کے کرشمے دکھائے۔

اب اِن اشعار کو آپ ندرتِ فکر نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے ؟

ایک دیوانہ بنا فصلِ بہاراں میں اگر
سینکڑوں بن گئے زنجیر بنانے والے

چُھپا لیا ہے مشقت نے عیبِ عریانی
ہے گردِ جسم پہ اس طرح پیرہن جیسے

لہو دینگے تو لینگے پیار، موتی ہم نہیں لینگے
ہمیں پھولوں کے بدلے پھول دو شبنم نہیں لینگے

وہ تو کہیئے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لئے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لئے

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دُور کے جانے والے

لیکن اِن جدّت طرازیوں کے باوصف ان کے ذوقِ سخن کا ذہنی جُھکاؤ میر ہی کے رنگِ تغزل کی طرف

اِن کی شاعری کے ہر دَور میں رہا۔ اور اَب تو میرؔ کے رنگِ سخن میں ایسے اشعار کہنے لگے ہیں کہ میرؔ کے دیوان میں کوئی اُنھیں شامل کر دے تو بڑے سے بڑے مدعیانِ فکر و نظر کو یقین ہو جائے کہ میرؔ کے شعر ہیں۔

اِن اشعار کی غمناک لہجگی کو آپ کیا کہیں گے ؟ :۔

میں روؤں ہوں رونا مجھے بھائے ہے   کسی کا بھلا اِس میں کیا جائے ہے
کوئی دیر سے ہاتھ پھیلائے ہے   وہ نامہرباں آئے ہے جائے ہے
دل آئے ہے پھر دل میں درد آئے ہے   یونہی بات میں بات بڑھ جائے ہے
خموشی میں ہر بات بن جائے ہے   جو بولے ہے دیوانہ کہلائے ہے

موسمِ گُل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے   تم تو بس سُنتے ہی عاجزؔ دیوانے ہو جاؤ ہو

پتھر کی طرح تیری ہر اک بات لگے ہے   دل توڑ کے ناصح تجھے کیا ہات لگے ہے
ہم نے جو دیا ہے وہ ہمیں جان لیے ہیں   سرمایۂ غم مُفت کہاں ہات لگے ہے
ہاں رہیو الگ صحبتِ اربابِ خرد سے   وہ بزم ہے یہ دن بھی جہاں رات لگے ہے

کیا جانے تمہیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے　　ہم کو تو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے

چھیڑے ہے کوئی تذکرۂ اہلِ وفا جب　　مُنہ پھیر کے کچھ شمع سے پروانہ کہے ہے

کب تک سُنیں عاجزؔ سے غمِ دل کی حکایت

کمبخت ہمیشہ یہی افسانہ کہے ہے

ان اشعار کو پڑھئے اور انصاف سے کہئے کہ میرؔ کے رنگِ سخن میں ایسی کامیابی کسی دَور میں کس کو نصیب ہوئی ؟ اگر آج کسی کے تغزل میں اس رنگ کی ہلکی سی پرچھائیں بھی ہو تو میری لاعلمی کو اُس نام سے محروم نہ رکھئے۔

کلیم عاجزؔ کا دماغ میرؔ کی کیفیاتِ سخن سے اتنا مسحور ہوا کہ انہیں میرؔ کے عہد کی پرانی زبان بھی اچھی لگنے لگی۔ ناسخؔ نے اس قدیم لب ولہجہ میں تصرفات کئے اور اُن کے قصیدہ پسند سامع نے اُردو کی لسانیاتی ترکیبوں میں مقامی بھاشاؤں کی خوش آہنگی سے زیادہ فارسی کی بلند آہنگی کو پسند کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کا لب ولہجہ بدلنے لگا۔ اِسے بدلنا کہئے یا بگڑنا ....

کچھ لوگ کلیم عاجزؔ کی زبان کی اس قدامت پسندی پر ناک بھاؤں چڑھاتے ہیں۔ یہ اپنا اپنا لسانیاتی ذوق ہے۔ جب ذہن بدلتے ہیں تو اُس کے ساتھ حواس خمسہ کا مزاج بھی بدلنے لگتا ہے۔ میرؔ سے پہلے اُردو شعرا معشوق کے لئے پریتم اور سجن استعمال کرتے تھے اور آئینے کی جگہ آرسی بولتے تھے۔ لیکن جوں جوں فارسیت کا غلبہ ان کے ذہنوں پر بڑھتا گیا انہیں مقامی بھاشاؤں کے رسیلے الفاظ پھیکے

لگنے لگے۔ ناسخ نے زبان کے ڈھانچے میں واضح تبدیلیاں کیں۔ جاؤ ہو کھاؤ ہو کی جگہ جاتے ہو کھاتے ہو انھیں پسند آیا۔ کبھو کو کبھی بنا دینے میں اُنہیں کیا مزہ ملا، یہ اُن کا لسانیاتی ذوق ہی جانے۔

بہر حال مجھے تو زبان میں اپنے عزیز کلیم عاجز کا قدامت پسندانہ رنگ جو پسند آیا تو میں نے بھی غیر ارادی طور پر اپنی بعض غزلوں میں عاجز کی جرأت کی اس طرح پیروی کی جیسے بوڑھے مصحفی نے اپنے عہد کے نوجوان ناسخ کی خیال مندانہ روش کی پیروی کی تھی۔ مصحفی کا مصرع پہلے میں نے یوں سُنا تھا:

ذرا جاگتے رہیو اے ہم صفیرو

پھر اُن کے صحیفۃ الغزل میں جب یہی مصرع یوں نظر آیا:

ذرا جاگتے رہنا اے ہم صفیرو

تو مصرع کی لطافت میری نظر میں کم ہو گئی۔ یوں غور کیجئے تو جاؤ ہو کھاؤ ہو کی جگہ جاتے ہو کھاتے ہو کی ترکیب لفظی ٹائم بھی زیادہ لیتی ہے اور SPACE بھی۔ اور اس پابندی کی وجہ سے کسی فکر کو عروض کے دائرہ میں اٹانا ہو تو خواہ مخواہ کی دشواری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

میں اپنی غزل میں جس کا پہلا مصرع یہ تھا:

آذری بھی حیراں ہے یار کیا بناتے ہو

یہ کہنا چاہتا تھا کہ:

سو بتوں کو توڑتے ہو اک خدا بناتے ہو

لیکن مصرع کسی طرح موزوں نہیں ہو رہا تھا۔ دفعتاً عاجزؔ کا انداز یاد آیا اور میں نے زمین بدل کر شعر کو یوں کر دیا :

آذری بھی حیراں ہے یار کیا بناؤ ہو
سو بتوں کو توڑو ہو اک خدا بناؤ ہو

اور زندگی میں پہلی مرتبہ پوری کی پوری غزل اسی زبان میں لکھی۔

میرؔ کی پیروی میں عاجزؔ کو ایک اور سلیقۂ فن بھی قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ میرؔ کی غزلیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ عارفانہ اور فلسفیانہ افکار کو بھی بڑے سلیقے کے ساتھ غزل کا پیرایہ دیدیتے ہیں۔ وہ فلسفہ اور تصوف کے مضامین بھی بیان کرتے ہیں، لیکن اس طرح، کہ نہ فلسفہ کی ثقالت باقی رہتی ہے نہ تصوف کی عارفانہ خشکی۔ یہ سلیقہ انہیں حافظؔ سے نہیں (کیونکہ یہ سلیقہ خود حافظؔ میں موجود نہیں) عراقیؔ اور فغانیؔ سے ملا تھا۔ غالبؔ نے ہرچند پیروی کی مگر یہ سلیقہ غالبؔ کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ غالبؔ کے مدرسۂ فکر کے عظیم ترین نمائندے اقبالؔ بھی اس سے ہمیشہ محروم رہے۔ یہ فنکارانہ چابکدستی اگر آئی تو کچھ داغؔ میں آئی اور داغؔ کے بعد عظیم آبادی کے ایک فنکار یگانہؔ چنگیزی ہیں۔ بیسویں صدی کے آخر نصف کے غزل گویوں میں اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ نام کلیم عاجزؔ ہے، جو بڑے سے بڑے مسائل کو بھی گھلا کر غزل کا میٹھا رس بنا دیتے ہیں اور بڑی ذمہ داری سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے آج اس سلیقۂ فن میں کوئی ان کا

شریک نظر نہیں آتا۔ ملاحظہ ہوں سلیقۂ فکر و فن کی چند مثالیں :

اُمید ایسی نہ تھی محفل کے ارباب بصیرت سے
گناہِ شمع کو بھی جرم پروانہ بنا دینگے

سُنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

سب آئینے سب آئینہ خانے انہیں سے ہیں
میں سنگ و خشت کیسے کہوں سنگ و خشت کو

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دُور کے جانے والے

نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ
درازدستیٔ گیسوئے یار دیکھو تو

عاجز کے ذہن کا سانچہ مذہبی ہے فلسفیانہ نہیں۔ اس لئے عموماً ان کے یہاں فکری بغاوت نہیں ملتی۔ لیکن شاعر شاعر ہے، کہاں تک مذہبی زنجیر اُسے اسیر رکھ سکتی ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی اس تسلط سے کاندھا جھٹکتے نظر آتے ہیں :

فتوائے شیخ یا دعوائے برہمن
یہ بھی دیوانہ پن وہ بھی دیوانہ پن

ہمارا ذکر کیا اب تو جناب شیخ صاحب بھی   اُسی کافر کی زلفِ پُرشکن کی بات کرتے ہیں

جناب شیخ پر افسوس ہے ہم نے تو سمجھا تھا   حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہوں گے

حرم کے رہنے والوں کو نامحرم وہی کہہ سکتے ہیں جو اہل طریقت ہوں۔ کلیم صاحب سلمۂ وضعاً اہل شریعت ہیں لیکن طبعاً اور مزاجاً اہل طریقت ہیں۔

سوئے اتفاق سے کلیم عاجز کا پورا مجموعۂ کلام میرے سامنے موجود نہیں ہے، اس لئے انتخاب کا جو حق ہے وہ میں اس مقالے میں ادا نہیں کر سکتا۔ پھر بھی اپنے حافظے کی جھولی سے ان کے جواہرات کی ایک مٹھی کاغذ پر بکھیر دیتا ہوں، انہیں چُنئے اور پرکھئے اور انصاف سے کہئے کہ ایسی سُتھری غزل کہنے والے ہندوستان اور پاکستان میں کتنے ہیں جن پر آتیس کا یہ مصرع صادق آسکے۔

لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

اب عاجز کے چند اشعار سُنئے ایسے شاعر کی زبان سے جو ایسا کہنے سے خود بھی عاجز ہو:

سُلگنا اور شئے ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا   جو ہم سے ہو رہا ہے کام پروانے سے کیا ہوگا

مناسب ہے سمیٹو دامنِ دستِ دُعا عاجز

زباں ہی بے اثر ہے ہاتھ پھیلانے سے کیا ہوگا

آرزو دامن ہی پھیلاتی رہی — فصلِ گُل آتی رہی جاتی رہی
دوست میرے حال پر روتے رہے — مجھ کو رہ رہ کر ہنسی آتی رہی

ساون کی گھٹا آ گئی میخانے کے نزدیک — ہونٹوں سے مگر فاصلۂ جام بہت ہے
ہنسنے کا تو موقع نہیں آ بیٹھ کے رولیں — یہ فرصتِ غم بھی دلِ ناکام بہت ہے

سخت دُشوار ہے پابندیٔ آدابِ جُنوں — جس کو بننا ہو سمجھ بوجھ کے دیوانہ بنے
پیرہن سُرخ نہیں ہے تو کفن سُرخ سہی — کوئی جوڑا تو گدا کے لئے شاہانہ بنے

خدا کا شُکر ہے احساں فراموشی نہیں آتی — ہمیشہ آپ کے بخشے ہوئے غم یاد آئینگے
بہت یاد آئے گی بے التفاتی چشمِ ساقی کی — یہ شیشے یہ سبُو یہ جام تو کم یاد آئینگے

ہمیں اچھا ہے بن جائیں سراپا سرگذشت اپنی — وگرنہ لوگ جو چاہیں گے افسانہ بنا دینگے
نہ جانے کتنے دل بن جائینگے اِک دل کے ٹکڑے سے — وہ توڑیں آئینہ ہم آئینہ خانہ بنا دینگے

تمہاری طرح زلفوں میں شکن ڈالے نہیں ہیں ہم — کہیں گے بات سیدھی پیچ و خم والے نہیں ہیں ہم

گلوں کی طرح ہم نے عمر کانٹوں میں بسر کی ہے — ہیں اہلِ ناز لیکن ناز کے پالے نہیں ہیں ہم

پائے خرد سے وقت کی زنجیر کیا کھُلے — آگے بڑھ اے جُنوں! کہ کوئی راستہ کھُلے

ہم بھی کچھ اپنے دل کی گرہ کھولنے کو ہیں — کس کس کا آج دیکھئے بندِ قبا کھُلے

سب نے دامن چاک رکھا ہے بقدرِ احتیاج — ہم کو دیوانوں میں بھی کوئی نہ دیوانہ ملا

ہم تو خیر آشفتہ ساماں ہیں ہمارا کیا سوال — وہ تو ستوریں جن کو آئینہ ملا شانہ ملا

جُدا جب تک تری زلفوں سے پیچ و خم نہیں ہونگے — ستم دُنیا میں بڑھتے ہی رہینگے کم نہیں ہونگے

اگر بڑھتا رہا یونہی یہ سودائے ستمگاری — تمھیں رُسوا سرِ بازار ہوگے ہم نہیں ہونگے

اور آخر میں عاجز کا یہ شعر جو اُن کے جذبۂ سخن آفرینی کا لب لباب ہے:

لے جا رہا ہوں درد میں ڈوبی ہوئی غزل — بے درد کے لئے کوئی سوغات چاہیے

○



کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

کنھیّا لال کپور

بہار کی مردم خیز سرزمین سے ایک غزل گو، ساون کی گھٹا کی طرح اٹھا ہے۔ اور آناً فاناً آسمانِ ادب میں چھا گیا ہے۔ وہ غزل نہیں کہتا، جادو جگاتا ہے۔ شاعری نہیں، ساحری کرتا ہے۔ وہ جب کبھی نغمہ سرا ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی بسیط و عریض ویرانے میں کوئی زخمی فرشتہ فریاد کر رہا ہے۔ سسکیاں بھر رہا ہے۔ اُس کی غزلیں پڑھنے یا سُننے کے بعد بے اختیار فراقؔ گورکھپوری کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے :

"غزلیں کب کہتا ہوں یارو میں غم کو لوریاں دیتا ہوں
کچھ رات گئے سوجاتا ہوں جب غم کو نیند آجاتی ہے"

اِس غزل گو کا نام ہے **کلیم عاجزؔ** ——

آج سے تیس برس پہلے، وہ ایک ایسے اندوہناک المیہ سے دوچار ہوا، جس نے اُس سے

ہمیشہ کے لئے شادمانی چھین لی ۔ چنانچہ اُس دن سے وہ اپنے ارمانوں کی لاش اُٹھائے اپنے غم کو شعروں کے سانچے میں ڈھال رہا ہے ۔ یہ غم، اُس کی والدہ ماجدہ اور بہن کی شہادت کا غم ہے ۔ جو اُس کی رگ و پے میں اِس طرح سرایت کر گیا ہے کہ دُنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی ہے ۔ ہر چند اُس نے کوشش کی، کہ اُس غم کا زہر، بھگوان شنکر کی طرح حلق سے نیچے اُتار لے اور نیل کنٹھ کہلائے ۔ لیکن وہ ، نیل کنٹھ نہ بن سکا ۔ آج بھی، جب وہ اپنی غزل کسی مجلس میں پڑھتا ہے، اور مجلس میں ہی کیوں، تنہائی میں بھی گنگناتا ہے، تو اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے ۔ اُس کے کان بجنے لگتے ہیں اور تیلہاڑہ کے کنوئیں سے، جو اُس کی والدہ اور بہن کی آخری آرام گاہ ہے، کوئی اُس سے سرگوشی کے انداز میں پوچھتا ہے : "کلیم ! ہمیں کیوں قتل کیا گیا ؟ کیا ہمارا گناہ صرف اتنا تھا کہ ہم مسلمان تھے ؟ کیا نیک اور شریف مسلمان ہونا جرم ہے ؟" ـــ "آسمانوں پر خدا یہ سب کچھ کیسے دیکھتا رہا ـــ انسان کا خون کیوں سفید ہو گیا ـــ کیوں ؟ کیوں ؟ کیوں ؟"

کلیم عاجز کے پاس اِس سوال کا جواب نہیں ۔ اُس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے اور وہ لہو کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے :

"زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے"

اسی غم کی بدولت اُس کی شاعری دیپک راگ بن گئی ہے۔ اُسے جو بھی سُنتا، یا پڑھتا ہے، سُلگتا ہے۔ اور کلیم عاجز کی طرح انسان کی ازلی بے بسی اور دیوتاؤں کی مسلّمہ بے رُخی پر کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے۔

آج سے باون سال پہلے، جب "بانگِ درا" شائع ہوئی تھی۔ اُس کے دیباچہ میں سر عبدالقادر نے اقبال کے اسلوبِ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا—— "اگر میں مسئلہ تناسخ کا قائل ہوتا تو کہتا کہ غالب کی رُوح اقبال میں حلول کر گئی ہے" —— میری رائے میں سر عبدالقادر نے یہ چونکا دینے والا فقرہ لکھ کر غالب اور اقبال، دونوں سے بے انصافی کی تھی، کیونکہ آہنگِ غالب اور آہنگِ اقبال میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ غالب کا کوئی شعر یا مصرع "بانگِ درا" یا "بالِ جبریل" میں شامل کر لیا جائے، وہ اجنبی سا لگے گا۔ اقبال کا انداز خطیبانہ ہے۔ اس میں مغربی موسیقی کا جوش و خروش ہے۔ غالب کا لہجہ سوز و گداز کا مظہر ہے۔ اقبال کہتے ہیں :

میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات ہیں

غالب فرماتے ہیں :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

سر عبدالقادر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کچھ نقّاد اب یہ کہہ رہے ہیں کہ کلیم عاجز کی غزلوں میں خدائے سخن میر تقی میر دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ اِس قول کا اطلاق شاید اُن کی ساری شاعری

پر نہ ہوتا ہو۔ لیکن اُن غزلوں پر ضرور ہوتا ہے جو اُنھوں نے پچھلے دِنوں کہی ہیں اور اس قول میں بہت حد تک صداقت ہے۔ میر کے انداز کو اپنانے کی غالب سے فراق تک، ہر شاعر نے کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر غالب نے کم از کم ایک غزل میر کے رنگ میں کہی جس کا مطلع ہے :

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں اپنی کر کے یاد شرما جائے ہے مجھ سے

فراق نے بھی اپنی چند غزلوں میں میر کے انداز کا کامیاب تتبع کیا ہے۔ خاص کر اپنی اس غزل میں :

فرقت کی غمگین راتوں کو یاد میں تیری رولیں ہیں
تاروں کو جب نیند آئے ہے ہم بھی گھڑی بھر سولیں ہیں

لیکن کلیم عاجز، دورِ جدید کے پہلے شاعر ہیں جنھیں میر کا انداز نصیب ہوا ہے۔ اُن کی غزلوں کے تیور نہ صرف میر کی بہترین غزلوں کی یاد دلاتے ہیں، بلکہ ہمیں اُس سوز و گداز سے بھی رُوشناس کراتے ہیں جو میر کا خاص حصّہ تھا۔ مثال کے طور پر اُن کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیے :

بیاں جب کلیم اپنی حالت کرے ہے — غزل کیا پڑھے ہے قیامت کرے ہے
بھلا آدمی تھا پہ نادان نکلا — سُنا ہے کسی سے محبّت کرے ہے
کبھی شاعری اُس کو کرنی نہ آتی — اُسی بے وفا کی بدولت کرے ہے

چھری پہ چھری کھائے جائے ہے کب سے | اور اَبتک جئے ہے کرامت کرے ہے
کرے ہے عداوت بھی وہ اِس ادا سے | لگے ہے کہ جیسے محبّت کرے ہے
یہ فتنے جو ہر اِک طرف اُٹھ رہے ہیں | وہی بیٹھا بیٹھا شرارت کرے ہے
قبا ایک دن چاک اُس کی بھی ہوگی | جُنوں کب کسی کی رعایت کرے ہے

کلیم عاجز کا یہ دعویٰ تعلّی نہیں، حقیقت پر مبنی ہے کہ :

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے، کسی سے کہا نہ جائے گا

ثبوت کے طور پر ان کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن پر میر کے نشتروں کا گمان ہوتا ہے :

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں | چلنا ذرا آیا ہے تو اِترائے چلو ہو

○

ترے غم میں تماشا بن گئے ہم | جو دیکھے ہے ہمیں دیکھا کرے ہے

○

اِک درد ہے جو شام سے اُٹھے ہے سحر تک | اِک سوز ہے جو صبح سے تا شام رہے ہے

○

لگے ہے پھول سُننے میں ہر اک شعر سمجھ لینے پہ انگارہ لگے ہے

○

گذرتے ہیں کچھ اِس طرح دن مُصیبت کے کسی کی جیسے شبِ انتظار گذرے ہے

○

بغیر اُس بے وفا کے جی لگائے جو سچ پوچھو تو دل کس کا لگے ہے

○

کبھی اُس طرف جائیو اے صبا تو مرا جس طرف آشیانہ پڑے ہے

○

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

○

کلیم عاجز روایت اور انفرادیت کا ایک محیر العقول امتزاج ہیں۔ اُن کے خون میں اُن تمام شعراء کا سلیقہ پایا جاتا ہے جو وَلی سے لے کر اقبال تک ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اُن کا اپنا رنگ ہے۔ اپنی آواز ہے۔ وہ کسی دوسرے کے نہیں، اپنے دماغ سے سوچتے ہیں۔ اور اُن کے سوچنے کا ڈھنگ اتنا انفرادی ہے کہ اُن کی غزل، ہزاروں غزلوں کے ہجوم میں پہچانی جاتی ہے۔ اکثر ایک سُبک اور لطیف طنز اُن کے اشعار کی دِلکشی کو دوبالا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر :

نہ وہ محفل جمی ساقی نہ پھر وہ دورِ جام آیا ترے ہاتھوں میں جب سے میکدہ کا انتظام آیا

○

نکلے ہم بے آبرو ہی آبروئے میکدہ ویسے کہنے کو جو چاہے پیرِ میخانہ کہے ہے

○

یہ پکارا سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی میرے آشیاں سے دھواں اُٹھا تو مجھے بھی اسکی خبر ہوئی

○

بعض اوقات طنز اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ شعر، شعر نہیں رہتا، تازیانہ بن جاتا ہے۔ جیسے :

اس چمن میں کیا یہی دستور ہے پھول کے تم مستحق، پتھر کے ہم

○

جلتا ہے چراغوں میں تو خون تیرے شہیدوں کا ہولی کی بچی دولت دیوالی میں کام آئی

ایک جدید انگریزی نقاد کے نزدیک اعلیٰ شاعری میں تین خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ وہ ہیں ـــــ موسیقیت، معنویت اور اشاریت ۔ ان تینوں میں سے اشاریت کا ہونا ازبس لازمی ہے۔

ذوق کا ایک شعر ہے :

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

یہ شعر چونکہ اشاریت سے خالی ہے، اس لئے اسے عمدہ شعر نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے برعکس غالب کے

اِس شعر کو لیجیے :

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی کیوں ترا راہگذر یاد آیا

اِس شعر میں جو اشاریّت ہے، اس کی وجہ سے سحرِ بلال کا نمونہ بن گیا ہے۔

کلیم عاجز کے اکثر اشعار اِن تینوں کسوٹیوں پر پُورے اُترتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، اُن میں موسیقیت، اشاریّت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہے۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے :

وہ تو کہیے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لئے ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لئے

ساز دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی ہلکی ہلکی سی صدا آتی رہی

دُور سے ہی وہ گذر جاتے ہیں مُنھ پھیرے ہوئے اُن سے بھی دیکھی نہیں جاتی پریشانی مری

کوئی مشکل نہ تھی تعمیرِ نشیمن، لیکن پاس تھا خانۂ صیّاد کی ویرانی کا

میخانے پر جب دیکھو تب بادل چھائے رہتے ہیں
جن کے گھر میں آگ لگی ہے، اُن کے گھر برسات نہیں

ہم جو گلشن میں تھے بہار نہ تھی   جب بہار آئی آشیاں نہ رہا
غم گراں جب نہ تھا گراں تھا مجھے   جب گراں ہوگیا گراں نہ رہا

○

مزا یہ ہے لیے بھی جا رہے ہیں جانبِ مقتل   تسلّی بھی دیئے جاتے ہیں سمجھا کے بھی جاتے ہیں

○

خدا جانے کس کس پہ الزام آتا   اگر ہم بیاں اپنی رُوداد کرتے

○

کلیم عاجز کی شاعری پر بہترین تبصرہ اُن کی اپنی غزلوں میں ملتا ہے۔ اُن کے نزدیک اُن کی شاعری چند آہوں کا مُرقّع ہے۔ ایک غزل میں اُنھوں نے کھُلے بندوں اعتراف کیا ہے :

مری شاعری میں نہ رقصِ جام، نہ مے کی رنگ فشانیاں
وہی دُکھ بھروں کی حکایتیں، وہی دل جلوں کی کہانیاں

اسی طرح اُن کی ایک غزل کا مطلع ہے :

اِس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے   کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے

ایک غزل گو کے لئے سب سے اہم مسئلہ زبان کا ہوتا ہے۔ نظم کی اپنی زبان ہے، غزل کی اپنی۔ غزل کی زبان جتنی سلیس اور ڈھلی ہوئی ہوگی، اتنا ہی غزل کا جادو سر چڑھ کر بولے گا۔ اِس کے

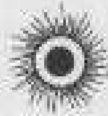
برعکس، اگر وہ ثقیل اور غیر مانوس ہوگی، غزل گو طلسم باندھنے میں ناکام رہے گا۔ کلیم عاجز غزل کی زبان سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ انھوں نے اکثر و بیشتر غزلیں اُس زبان میں لکھی ہیں جسے "روزمرّہ" کہا جاتا ہے۔ اور جس میں خاص و عام اہلِ زبان تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ گھلاوٹ اور گداز کی خاطر انھوں نے وہ الفاظ استعمال کرنے سے بھی گریز کیا ہے جنھیں کچھ اساتذہ نے متروک قرار دیا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک مرتبہ کہا تھا، آرکسٹرا کی مدد سے کسی دُھن کو پیش کرنا عظیم آرٹ نہیں کہلاتا۔ مزا تو جب ہے کہ صرف ایک ساز کی مدد سے کوئی ایسی دُھن پیش کی جائے جسے سُن کر سامع مبہوت رہ جائے۔ کلیم عاجز کے کلام کی سلاست اس بات کی شاہد ہے کہ اُنھیں صرف ایک ساز کی مدد سے دُھن پیش کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ عام طور پر بھاری بھرکم تراکیب یا عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ وہ اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ غزل اُس نازک آبگینے کی طرح ہے جسے ایک سخت یا نامناسب لفظ بھی ناقابلِ تلافی ٹھیس پہنچا سکتا ہے۔ ایک روایتی توضیح کے مطابق غزل کے معنی عورتوں سے گفتگو کرنا ہیں۔ ظاہر ہے گفتگو کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ ایک ذرا سی لغزش سارے مزا کو کرکرا کر سکتی ہے۔ ایک اچھی غزل اور بُری غزل میں وہی فرق ہوتا ہے جو ایک اچھی اور بُری گفتگو میں ہوتا ہے۔ اچھی گفتگو کا تقاضا ہے، نہ صرف موضوع، بلکہ لب و لہجہ نہایت شائستہ ہو۔ سُوقیانہ پن سے احتراز کیا جائے۔ اور طنز و مزاح کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر ہو۔ اگر مختصر ترین الفاظ میں اچھی غزل کی تعریف کرنا مقصود

ہو تو کہا جا سکتا ہے، ایسی غزل جس کا ہر شعر نشتر کی طرح دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

کلیم عاجز نے غزل کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ بلاشبہ اُن کا شمار اُن شعراء میں کیا جا سکتا ہے جو وقتاً فوقتاً عروسِ غزل کو سنوارنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جنھیں زمانۂ حال سے کہیں زیادہ زمانۂ مستقبل کا شاعر کہا جاتا ہے۔ کلیم عاجز نے ایک نئے دبستان کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اُس نے نہ صرف اپنے ہم عصروں کے لئے نئی راہیں کھولی ہیں بلکہ یہ بشارت بھی دی ہے :

نہ ساتھ دینگی یہ دم توڑتی شمعیں
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے



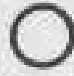


تعارف



سیّد علی عباس

سیّد علی عباس آئی۔پی۔ایس، ریٹائرڈ ڈی۔آئی۔جی پولس، اسکاٹ لینڈ یارڈ لندن کے تربیت یافتہ۔ بہار کے ایک مشہور اور قدیم تہذیبی مرکز مجھوآ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، پولس کے اعلیٰ کمان کی نازک ذمہ داریوں میں ہمیشہ مصروف رہنے کے باوجود زمانۂ تعلیم سے اس وقت تک شعر و ادب کی چولی سے دامن کی طرح وابستہ ہیں۔ ہر زمانے میں ادب شاعری کی خدمت اور محبت میں مجنوں بنے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کلب قائم کر کے شعر و سخن کی مثالی محفلیں سجائیں۔ اور ۱۹۸۱ء میں انیسؔ سنٹینری کے موقع پر میر انیسؔ کے فن پر ایک جامع، دلکش اور دیدہ زیب کتاب شائع کر کے خوش ذوقی کے ساتھ خوش سلیقگی کا بھی ایک نمونہ پیش کیا۔ زندگی کے تجربات افسانوی پیرائے میں اکثر لکھتے اور ریڈیو پر سناتے رہے ہیں۔ اس وقت "بزم کاف" کے ذمہ دار اعلیٰ ہیں۔



میں نے ۱۹۶۲ء میں کلیم عاجز کو پہلی بار دیکھا اور سُنا۔ اور ویسی ہی حیرت و مسرت ہوئی جو ایک نجومی کو ہوتی ہے جب وہ اپنی دُور بین میں اچانک ایک ایسے انوکھے انجان ستیارے کو آسمان کی خلاؤں میں گردش کرتے دیکھتا ہے جس کے بارے میں نہ اُس نے کبھی پڑھا تھا نہ سُنا تھا۔

پٹنے کی وہ ایک رنگیں شام تھی۔ انجمن اسلامیہ ہال میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شوق مجھے بھی کھینچ کر وہاں لے گیا۔ پہنچا تو دیکھا ڈائس پر بہار کے سب ہی مشہور و معروف شعرا جلوہ افروز تھے۔ علامہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی، پروفیسر عبدالمنان بیدل، حافظ شمس الدین شمس وغیرہ۔

قبل اس کے کہ استادوں کی باری آئے صدر نے کلیم عاجز کا نام پکارا۔ پہلے کبھی یہ نام سُنا نہیں تھا۔ سمجھا کہ نو واردانِ اقلیم سخن میں سے ہوگا کوئی طفل۔ دیکھا تو پتلا دُبلا، نحیف و زار، نازک سا ایک نوجوان، نیچی نظریں کئے، دبے پاؤں مائک پر آیا۔ لباس سے سادگی ٹپک رہی تھی اور چال سے شرافت۔ صورت پہ اُداسی چھائی تھی مگر تیور سے عزم و استقلال عیاں تھا۔ کچھ دیر چُپ کھڑے رہنے کے بعد اس نے ترنم میں اپنی غزل شروع کی اور فضا میں ایک



عجیب سی غمگی چھا گئی۔ جہاں تک یاد آتا ہے وہ غزل یہ تھی :

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا

تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا

گو ستم نے تیرے ہر اِک طرح مجھے نا اُمید بنا دیا

یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کر کے دِکھا دیا

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے

جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا

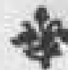
تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں

ترے گیسوؤں کو سنوار کے تجھے آئینہ بھی دِکھا دیا

یہ غریب عاجزؔ بے وطن یہ غبار خاطرِ انجمن

یہ خراب جس کے لئے ہوا اُسی بے وفا نے بھلا دیا

غزل تمام ہوئی تو نہ پوچھئے سُننے والوں کا کیا حال تھا۔ ہر دل میں بس ایک ہی خواہش تھی، کاش یہ نوجوان کچھ دیر اور غزل سرا رہتا۔ کاش اُس کی درد بھری پیاری پیاری آواز سُنتے ہی رہتے۔ 'ایک اور! ایک اور!' کا شور ہوتا رہا۔ مجمع لاکھ چیخا پکارا 'عاجزؔ' تو دو گیارہ ہو گئے۔ وہ گئے اور لگا ان کے ساتھ ہی ساتھ مشاعرے کی ساری رونق بھی چل دی۔ اپنے دل کا یہ حال تھا جو



بہار کے رخصت ہونے کے بعد کسی چمن کا ہو !

مشاعرہ ختم ہونے پر میں یہ جاننے کے لئے بیقرار رہا کہ آخر تھا یہ کون انجان شاعر جو دل کے ہر تار کو یوں جھنجھوڑ کر چل دیا۔ ایک دوست سے جو کلیم صاحب کو بہت قریب سے جانتا تھا، میں نے پوچھا " بھئی یہ کلیم آخر ہیں کون ؟ یہ بلا کا درد کہاں سے آیا ظالم کی آواز میں جو اچھی خاصی شام میں بیٹھے بٹھلائے سب کو رُلا گیا ؟" بولے " آپ نہیں جانتے انھیں ؟ ارے یہ پٹنہ ضلع کی اُسی مشہور بستی تیلہاڑہ کے ہیں جو کبھی بڑی ہنستی بولتی جیتی جاگتی بستی ہوتی تھی۔ ۴۶ء کے فسادات میں ایک دن ناگہاں یوں اُجڑی کہ دم توڑتے توڑتے تشدد و بربریت کی تواریخ کا ایک نہایت ہی دردناک باب لکھ گئی۔ ٹھیک عید کے دن سات آٹھ سو باشندے اس کے تہ تیغ ہوئے۔ ان میں سے بیس بائیس تو بہت ہی قریبی رشتہ دار کلیم کے تھے جو سورج ڈھلتے ڈھلتے راہیٔ ملک عدم ہوئے !! شہید ہونے والوں میں ان کی والدہ ماجدہ بھی تھیں اور چھوٹی بہن بھی ——— !

اُس قیامت کے دن ایک طرف تو تیلہاڑہ میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور دوسری طرف کنوئیں بھر رہے تھے اُن معصوم بے بس عورتوں کی لاشوں سے جنھیں بلائے ناگہانی سے بچ نکلنے کا کوئی اور راستہ نظر نہ آیا اور وہ اُن میں کود پڑیں ......" یہ سب سُننے کے بعد کوئی دقت نہ رہی کلیم عاجز کی وہ سہمی سہمی سی صورت ، ان کا درد بھرا لہجہ اور ان کی غزلوں کی رنگت سمجھنے میں۔ تعجب مگر ہمیشہ ہی اس بات پر رہا اور آج بھی ہے کہ ایسا دُکھتا دل سینے میں رکھتے ہوئے کوئی غزلوں



کیسے ہوسکتا ہے ! خود کلیم کہتے ہیں :

غزل جو سنتا ہے میری عاجزؔ وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گذری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

کم سنی ہی میں عاجزؔ کا سینہ زخموں سے چھلنی ہوا۔ شباب آیا تو " روز ایک زخم تازہ تھا زخم کہن کے ساتھ "! پھر بھی نہ ان کے کلام میں تلخی ، نہ لب پہ شکایت ، نہ زبان پر کبھی بد دعا آئی۔ بلکہ جنھوں نے ظلم ڈھائے اور ان کی دنیا کو تاریک و تاراج کر دیا انہی کو سمجھنے اور پیار سے سمجھانے کی آج تک مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں۔ کلیمؔ کی ایک غزل کے چند اشعار سنئے تو سمجھ میں آئے گا کہ یہ کس دل گردے کا بنا ہوا انسان ہے۔ کہتے ہیں :

مرا حال پوچھ کے ہم نشیں مرے سوزِ دل کو ہوا نہ دے
بس یہی دعا میں کروں ہوں اب کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے

یہ جو زخمِ دل کو پکائے ہم لئے پھر رہے ہیں چھپائے ہم
کوئی نا شناسِ مزاجِ غم کہیں ہاتھ اس کو لگا نہ دے

تو جہاں سے آج ہے نکتہ چیں کبھی مدتوں میں رہا وہیں
میں گدائے راہِ گذر نہیں مجھے دور ہی سے صدا نہ دے



وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لئے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

عاجز کی غزلوں کو غور و تحقیق سے پڑھئے اور ان کی زندگی کے کچھ حالات جاننے کی کوشش کیجئے تو آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ وہ ہوا کا کون سا جھونکا تھا جس نے ان کی زندگی کا رُخ پلٹ دیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کے لب و لہجہ میں وہ درد بھر دیا کہ جو بھی ان کی غزل ان سے سنتا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتا ہے۔ ان پر جو ستم ٹوٹے ان کا ردّ عمل کیا ہوا خود کلیم ہی بتلاتے ہیں :

مجھ کو تو فصلِ گُل یہی شغل سپُرد کر گئی
صحنِ چمن کی خاک اُڑا ماتمِ آشیانہ کر

جہاں غم ملا اُٹھایا پھر اُسے غزل میں ڈھالا — یہی دردِ سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے — بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

وہی سمجھتے ہیں مجھ کو جو مجھ کو سنتے ہیں — مری غزل میں مری زندگی مجسّم ہے



بیس بائیس برسوں سے میں کلیم عاجز کو سُنتا چلا آیا ہوں۔ اِدھر دو چار برسوں میں جب سے کلیم نے میر کے طرزِ کلام کو اپنایا اور میر کی زبان میں اظہارِ جذبات کرنے لگے ہیں ان کی غزلوں کی دل کشی دو بالا ہو گئی ہے۔ کلیم کی غزلوں میں نے نشتر بھی پائے اور مرہم بھی۔ پھول بھی ہیں کانٹے بھی۔ مثنوی بھی ہے اور مرثیہ بھی۔

کلیم جب اپنے مخصوص ترنّم میں اپنی غزل سُناتے ہیں تو سُننے والوں پر کچھ ویسی ہی کیفیت طاری ہوتی ہے جیسی جوش کے دل میں پپیہے کی 'پی کہاں' سُن کر ہوا کی۔ جوش اس کیفیت کی یوں تصویر کھینچتے ہیں :

ہماری رُوح سوزِ عشق سے اس طرح جلتی ہے	پپیہا جب تڑپتا ہے ہوا میں 'پی کہاں' کہکر
بلا کی دھوپ میں جیسے نازنیں کوئی	تلاشِ تربتِ عاشق میں پتھر پہ ننگے پاؤں چلتی ہے

میں نے دیکھا ہے کلیم بالعموم غزل کہتے ہیں کسی بڑے حادثے، کسی المناک سانحے، کسی ظلم ناروا، یا کسی دل ہلا دینے والے واقعے کے زیرِ اثر۔ سیاسی طوفان، سماجی ہیجان، دُنیا کے ستم، انصاف کا خون اور انسانیت کی کمی دیکھ کر وہ تلملا اُٹھتے ہیں اور اپنے دل کی دھڑکنوں کا جب کوئی علاج نظر نہیں آتا تو غزل کہنے بیٹھ جاتے ہیں تاکہ کسی طرح تو رات کٹے! اور غزل بھی اس انوکھے انداز کی ہوتی ہے کہ سمجھنے والوں کے لئے مرثیہ ہو جاتی ہے، مگر اوچھی نظر رکھنے والوں کے لئے محض عشقیہ شاعری جس میں میر صاحب کی غزلوں کی طرح صرف رونا گانا ہے اور کچھ نہیں۔



اب اُن کی ۲۳ء کی کہی ہوئی ایک سادہ سی غزل کے چند اشعار غور فرمائیے جو عقل و فہم رکھنے والوں کے لئے کس درجہ معنی خیز ہیں، مگر طفلِ مکتب یا پیر نابالغ کے لئے شاید مضحکہ خیز ہوں :

کس ناز کس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

مے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ
پینا نہیں آئے ہے تو چھلکائے چلو ہو

ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا
تم کیا ہو تمھیں سب سے کہلوائے چلو ہو

اکثر کلیم عاجز کی' جذبات و محسوسات سے لبریز غزلیں ان کی زبانی سُن کر میرے دل پر کچھ ویسا ہی اثر ہوا جو نیم شب کے سناٹے اور بھیانک تاریکی میں پڑوس کی جھونپڑی سے ایک نوجوان کی اچانک موت پر اُس کی کمسن بے سہارا بیوہ کی گریہ و زاری سُن کر ہو! اکثر ان کا ترنّم ایسا لگا "جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم" یہی انوکھی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آج ان کے "نغموں کی ہر اک جا شہرت ہے نالوں کا تمام افسانہ ہے"۔



کلیم کا فکر و فن کچھ بالکل ہی جداگانہ ہے۔ نہ انھوں نے کسی کی نقل کی، نہ اُن کی نقل کوئی کر سکتا ہے۔ ان کی اپنی ہی ایک ٹھاٹ ہے۔ اپنا ہی انداز۔ اپنی دُھن ہے اور اپنا مزاج۔ باتوں باتوں میں بے دھڑک دُنیا کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کر ڈالتے ہیں۔ بغیر شمشیر و سپر ظالموں پر وار کر بیٹھتے ہیں۔ مگر ان کے وار میں نہ غیظ و غضب ہوتا ہے نہ کسی کو زخمی کرنے کا کبھی ارادہ رکھتے ہیں۔ ایک ستمگر کو بھری محفل میں ستمگر کہکر ہی ان کے دل کو تسلی ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک ظالم کو یہ بتلا کر کہ ظلم کرنا بُری بات ہے، خدا سے ڈرنا چاہئے وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ایک دشمن کو بھی کسی طرح کی اذیت پہونچانا ان کی شریعت میں گناہ ہے۔ 'وفاداری بشرطِ استواری' آپ کا ایمان ہے۔ وہ کانٹوں سے صرف نباہ ہی کرنے کے قائل نہیں بلکہ ہر حال میں ان کے لئے "خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر" ہیں۔ تب ہی تو ڈٹ کر کہتے ہیں :

بازی وفا کی ہار کے پیارے نہ جائیں گے
کیا دن ترے ستم کے گذارے نہ جائیں گے ؟

دریائے غم میں پانی اگرچہ ڈباؤ ہے
ہم ڈوبنے کے ڈر سے کنارے نہ جائیں گے ؟

اس قدر ستم زدہ انسان پھر بھی ایسا وفا شعار، اس درجہ وضعدار، اتنا خوددار، اتنا بے باک اور ایسا محبِ وطن آجکل کی دُنیا میں ڈھونڈھنے سے بھی کہاں ملتا ہے ؟ اسی وجہ سے



میری نظر میں ان کی عزت کچھ اور سوا ہے۔ کلیم صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک قابلِ قدر انسان ہیں۔

کلیم جو غزل کہتے ہیں وہ محض شاعری ہی نہیں ہوتی۔ اس میں مقصد ہوتا ہے، مطلب ہوتا ہے، سبق ہوتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ لُطفِ غزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں ذی فہم و ذی ہوش کے لئے بانگِ درا سے کچھ کم نہیں۔ ہاں ان کے کلام کا لباس واعظ کا لبادہ نہیں ہوتا، غزل کا شبنمی پیراہن ہوتا ہے۔ غور کیجئے تو ان کی غزلوں میں آپ کو تواریخ بھی ملے گی اور فلسفہ بھی۔ حال پر تبصرہ بھی اور مستقبل کا جائزہ بھی۔ دُکھے دلوں کی پکار بھی پایئے گا اور باغی کی للکار بھی ۔۔۔!

کلیم کی غزلوں میں آپ 'گُل و بُلبل' تو پائیں گے اور 'سرو و سمن' بھی۔ 'گیسو و شانہ' کا بھی ذِکر ملے گا اور 'بہار و خزاں' کا بھی تذکرہ۔ مگر اِن کے 'گُل و بُلبل'۔ 'بہار و خزاں۔ 'گیسو و شانہ'۔ 'ساغر و ساقی' کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ پورے طور سے لُطف اندوز ہونے کیلئے آپ کو ان کی غزلوں کی تہہ تک پہنچنا ہوگا جس طرح موتی نکالنے کے لئے سمندر کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر ان کی غزلوں کو سمجھنے کے لئے اتنی کاوش اور دماغ پر زور دینے کی بھی ضرورت نہیں جتنا کہ آجکل کے موڈرن آرٹ یا جدید شاعری کو سمجھنے کے لئے ہوتی ہے۔ اسلئے کہ ان کی غزلوں میں بڑی سادگی ہوتی ہے، الفاظ بہت عام فہم ہوتے ہیں۔ ہلکے پھُلکے اشاروں میں

بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ میں نے تو ان کی غزلوں میں وہی دلکشی اور سادگی پائی جو میر کے کلام میں ہے، میرا کے بھجن میں ہے، یا کبیر کے دوہوں میں ہے۔

خوش وضع، خوش خصال، خوش کلام، خوش گلو، ایک نہیں کئی اوصاف ہیں جنھوں نے کلیم کو ہر دل عزیز بنا ڈالا۔ بہار کے لئے یہ باعثِ فخر ہے کہ اس پُر آشوب دَور میں جبکہ اُردو کی بقا کا مسئلہ درپیش ہے، یہیں کا ایک نوجوان گوشۂ تنہائی میں بیٹھا گیسوئے اُردو کو سنوارتا رہا ہے اور ہر ممکن کوشش کر رہا ہے کہ اُس کی موت کا دن ٹل جائے۔ چمنستانِ اُردو کے گُل بوٹوں کو یہ شخص اپنے خونِ جگر سے سینچ رہا ہے تاکہ اُن میں جان اور جان کے ساتھ رنگ و بُو باقی رہ جائے۔ کلیم کا انکسار ان کے مُنہ پر ہاتھ نہ دھر دیتا تو علّامہ اقبال کی طرح کلیم بھی برسرِعام سَو بار کہے ہوتے :

باقی ہے ابھی رنگ مرے خُونِ جگر میں

فراق صاحب نے ایک جگہ فرمایا تھا :

آنے والی نسلیں تم پر ناز کریں گی ہمعصرو
اُن کو جب معلوم یہ ہوگا تم نے فراق کو دیکھا ہے

کلیم وہ ہیں کہ آج شعر و سخن کے دلدادہ فخریہ کہتے سُنائی دیتے ہیں ’ہم نے بھی کلیم کو سُنا ہے‘۔



اس خراجِ تحسین پر کلیم جتنا بھی مغرور ہوں کم ہے۔ پر طبیعت کچھ ایسی پائی ہے کہ نہ مشاعروں میں واہ واہ سننے کے خواہاں ہوتے ہیں نہ گفتگو میں اپنی تعریف سننا پسند کرتے ہیں۔ اسی انکسار کا نتیجہ ہے کہ شاید کبھی انہوں نے سوچا بھی نہیں کہ ان کا کلام اب شائع ہونا چاہیئے۔ یا سوچا بھی ہو تو اپنوں سے بھی اس خواہش کا اظہار نہ کیا۔ وہ اگر میں پیچھے نہ پڑتا اور میرے عزیز دوست فخرالدین وینک صاحب نے زور نہ لگایا ہوتا تو لوگوں کے مسلسل اصرار کے باوجود کلیم شاید آج بھی اپنا کلام شائع کرانے پر آمادہ نہیں ہوتے اور ان کا دیوان ان کے ذہن ہی میں بند پڑا رہ جاتا۔ اس ڈر سے کہ اُردو ادب کی جھولی کو جن لعل و گہر سے کلیم نے بھرا ہے وہ کہیں کھو نہ جائیں، میں نے بڑی مشکلوں سے ان کی غزلوں کو اکٹھا کرایا، تاکہ قدردانوں کے لئے یہ خزانہ ہمیشہ کیلئے محفوظ رہ جائے اور وہ جو شاعری کا سبب ہوا، زمانہ اس کو بھلا نہ دے۔ ——— !

جس آگ میں کلیم بیسوں برس سے جلتے بجھتے رہے ہیں اور تپ کر کندن بنے ہیں اُسے مدِنظر رکھتے ہوئے وہ اپنے دیوان کا نام 'آتشِ گُل' یا 'آتشِ نمرُود' رکھ سکتے تھے، مگر انہوں نے وہ نام رکھا ہے جو وضاحت پسند طبیعتوں کو بھی مُطمئن کردے۔ کلیم نے اپنے غم کو کبھی غم نہیں سمجھا بلکہ ایک نایاب عطیہ سمجھا جسے وقت اور زمانے نے انھیں پیش کیا اور انہوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے۔ اب اسے ان کی حُبّ الوطنی کہیے یا دیوانہ پن، آپ کو اختیار ہے۔ کلیم مگر اس خیال پر تکیہ کئے مست رہتے ہیں: "میں تیری بلا سے اُجڑ گیا ترا حوصلہ تو نکل گیا" ——— اور جو کبھی کسی

"ناشناسِ مزاجِ غم" نے ان کی آنکھوں کو نم پا کر چٹکی لی تو جھڑک دیا یہ کہکر :

"میں چاک دامن جو بھر رہا ہوں یہ میرا دیوانہ پن نہیں ہے"

یوں تو کلیم کا اب دیوان ہی آپ کے سامنے ہے پھر بھی ان کے چند اشعار کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں تو آپ بھی کلیم کا مزاج، ان کا دِل، ان کا درد، ان کا مقصدِ زندگی، ان کا فلسفۂ حیات کچھ زیادہ آسانی سے سمجھ پائیں گے۔ میرے لئے کلیم کے اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا کوئی چُبھتا ہوا شعر میں نے جب بھی سُنا "میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" اور میری طرح بہتوں نے یہی محسوس کیا ہوگا۔

اب چند اشعار کلیم کے ملاحظہ فرمایئے جو اُن کے ذہنی کرب اور قلبی کشمکش کے غماز ہیں :

یہ پُکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی! وہ سحر ہوئی!!
مرے آشیاں سے دھواں اُٹھا تو مجھے بھی اسکی خبر ہوئی

مجھے کیا اگر ترے دوش سے تری زُلف تا بہ کمر ہوئی
کہ میں ایسا خانہ خراب ہوں کبھی چھاؤں میں نہ بسر ہوئی

اِس چمن میں کیا یہی دستور ہے　　پھول کے تم مستحق پتھر کے ہم؟



دوستوں کا کرم معاذاللہ　　　　شکوۂ جورِ دشمناں نہ رہا

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ　　　　رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

میں نگاہِ باغباں میں کوئی اور ہوگیا ہوں　　　　ابھی چار دن ہوئے ہیں کہ جلا ہے آشیانہ
تجھے اے غمِ محبت اِدھر آ گلے لگا لوں　　　　نہ ترا کہیں گذر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

محبت ایسی دُنیا ہے کہ جس میں　　　　گلستاں کم ہیں ویرانے بہت ہیں
مری جیسی کہانی کم سُنو گے　　　　گل و بُلبل کے افسانے بہت ہیں

رہے گا سِلسلہ دار و رسن کا　　　　جہاں دو چار دیوانے رہینگے
خرد زنجیر پہناتی رہے گی　　　　جو دیوانے ہیں دیوانے رہینگے

بڑے خوش نصیب آپ ہیں کہ ابھی تک　　　　محبت سے پہلو بچائے ہوئے ہیں
کسی دن تو ہاتھ آئے گا اُن کا دامن　　　　جو دیوانہ ہم کو بنائے ہوئے ہیں

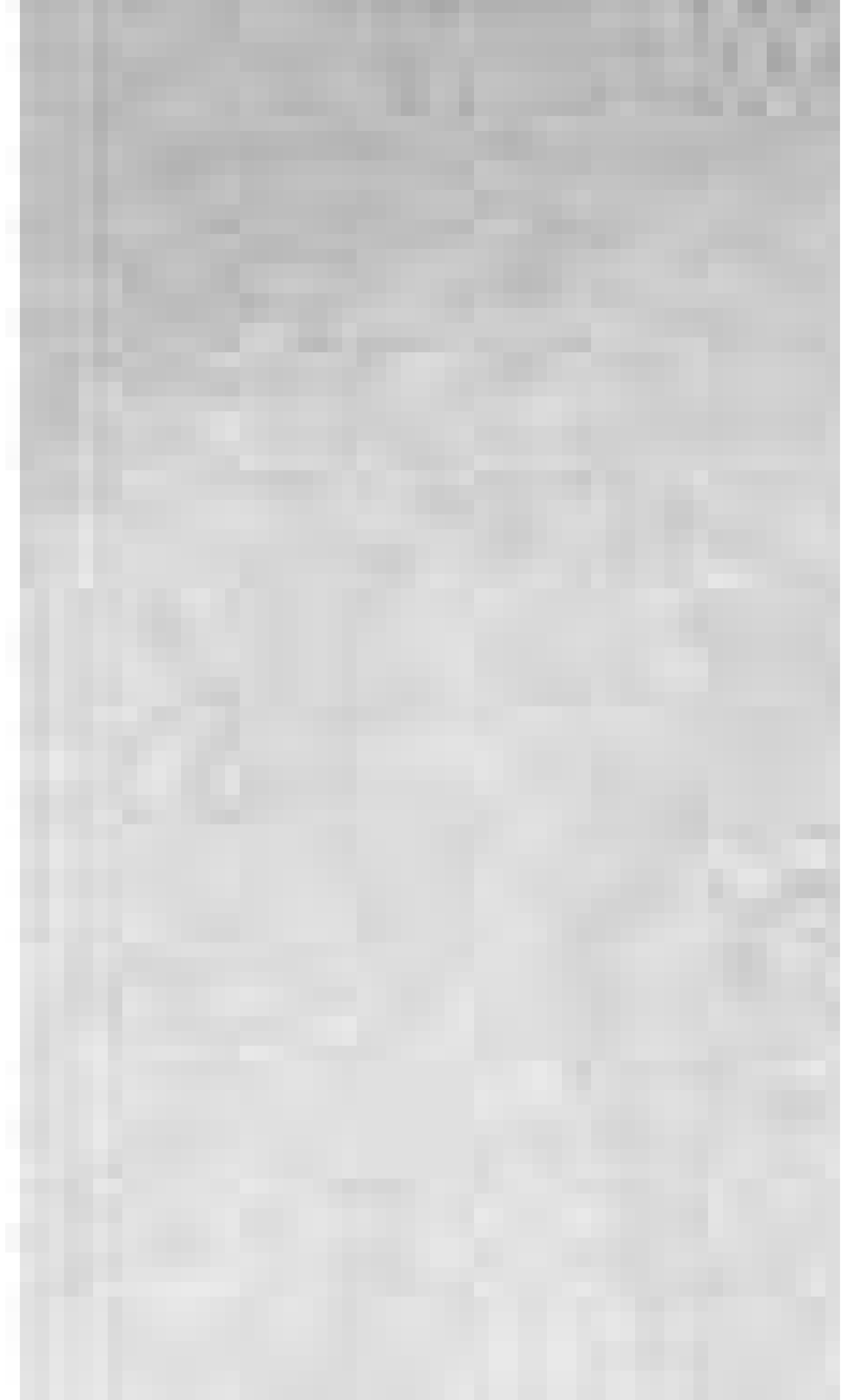


کلیم کا تعارف تو ہو چکا۔ اب آخر میں اتنا بتلا دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں، کہ اس کتاب کو شائع کرانے کی ساری کوششیں ہماری بے سود ہوتیں اگر چند ایسے ذی فہم اور تجربہ کار لوگوں کا ہمیں تعاون حاصل نہ ہوتا، جن کے ٹھوس قدم اور قابلِ قدر مشوروں نے مشعلِ راہ کا کام کیا۔ اُنکے خلوص اور اُنکے عزم و استقلال کا میں دل سے معترف ہوں اور مدّاح۔ اس سلسلے میں خاص طور سے جو قابلِ ذکر اور قابلِ ستائش ہیں وہ ہیں: جناب فخرالدین ونک صاحب، جناب رضا نقوی واہی، کاظم ہاشمی صاحب، شری گور بوس، شری ہمالیہ پریس کے پروپرائٹرس شری سیارام اور للی بابو، اور پٹنہ کے مشہور و معروف خوشنویس جناب صوفی صاحب۔ جس طرح ہماری جدّ و جہد میں ان سبنے ہاتھ بٹایا ہے اس کے لئے میں ان کا بیحد ممنون و مشکور ہوں — یہ اُنھیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ کلیم کی غزلیں جسے سُننے کے لئے لوگ بیتاب رہا کئے ہیں، اب شائع ہو کر قدردانوں کے ہاتھ میں ہونگی۔ اور یہ مجموعہ کلام اُردو ادب کی شاہراہ پر ایک نمایاں سنگِ میل ہوگا اور اُردو ادب کے خزانوں میں ایک انمول اضافہ۔

عباس

چیئرمین بزمِ کاف۔ پٹنہ

ع۱: واضح رہے کہ یہ تعارف طبع اول کا ہے، اب یہ تیسری بار اضافے کے ساتھ طوبیٰ پبلیکیشنز حیدرآباد سے شائع کیا جا رہا ہے۔



ادا کیونکر کرینگے چند آنسو دِل کا افسانہ

کلیم عاجز



اِس طرف چند برسوں سے مختلف حلقوں کے احباب اور بزرگوں کا بے حد اصرار ہے کہ میں جو کچھ اس بیس۲۰ بائیس۲۲ سال سے کر رہا ہوں اُسے مجموعے کی شکل میں ترتیب دے کر شائع کر دوں۔ ۱۹۶۰ء تک میں اس معاملے میں غیر جانب دار رہا۔ جب کسی ادارے یا رسالے کی طرف سے اصرار ہوا تو کوئی چیز اشاعت کے لئے دے دی۔ دس بارہ سال سے پھر وہ کیفیتِ مزاج عود کر آئی جو ابتدائے شعور سے تھی، جو اپنا خاندانی مزاج ہے، بلکہ اِسے ہُنرمندانِ بہار کا مخصوص مزاج کہنا چاہئے۔ یعنی شہرت سے گریز، نام و نمود سے پرہیز، اِس موضوع پر اپنے پی۔ ایچ ڈی کے مقالے میں کافی تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ چنانچہ دس بارہ سال سے غالباً میری کوئی غزل پرچے یا رسالے میں شائع نہیں ہوئی، اِلّا یہ کہ ریڈیو سے نقل حاصل کر لی گئی اور چھاپ دی گئی۔ یا مشاعرہ میں یاروں نے غزل نوٹ کی اور چھپوا دی۔ ایسا ہوا ہے اور ایک دو بار میں نے دوستوں اور عزیزوں سے سخت ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ ایک وجہ تو یہ ہے جو مجموعے کی اشاعت میں اتنے سدِّ راہ رہی۔ ایک دوسری وجہ بھی ہے، لیکن اُسے کیا بتاؤں اور بتاؤں تو کون تسلیم کرے۔ یہ کون مانے



کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ دوسروں کے لئے نہیں، اپنے لئے کہتا ہوں۔ سُنانا مقصود کم ہے، گُنگُنانا اصل مقصود ہے۔ کون مانے کہ جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ کہتا رہا ہوں وہ ایک خاموش خود کلامی ہے۔ یہ دل بہلانے کے لئے دل سے باتیں ہیں۔ کوئی تماشہ سے دل بہلاتا ہے، کوئی ساز سے، کوئی نغمہ سے، کوئی تصویروں سے، کوئی ریڈیو سے، کوئی سینما سے۔ میں بھی ساز و نغمہ سے خوب قریب رہا۔ تصویریں کھینچیں اور کھنچوائیں، سینما کے ساتھ دیوانگی کی حد تک وابستگی تھی۔ لیکن ستائیس[۲] سال پہلے ایک صبح ایسی آئی جس نے پچھلی شاموں کو ایک خواب فراموش بنا دیا۔

ایک سویرا ایسا آیا اپنے ہوش پہ رالے
اس کے آگے کیا پوچھو ہو آگے کہا نہ جائے

اُس صبح کے بعد ساز و نغمہ کی پھر کوئی شام نہ آئی۔ پھر کوئی محفل آراستہ نہیں ہوئی۔

نہ وہ محفل سجی ساقی نہ پھر وہ دورِ جام آیا
ترے ہاتھوں میں جب سے میکدے کا انتظام آیا

اس کے بعد سے ایک سوگوار تنہائی کا احساس کبھی ختم نہ ہوا۔ دو تین سال کے بعد اس دکھ بھری تنہائی سے گھبرا کر خدا جانے کیا بہانہ ہوا کہ میں نے یہ خود کلامی شروع کی۔ یہ سوگوار تنہائی پھر کبھی انجمن میں تبدیل نہ ہو سکی۔ میری شاعری اُس سوگوار تنہائی کو ایک مونس، ایک ہم نوا دینے کی ناکام کوشش ہے۔ گرچہ میں بظاہر ہر وقت انجمن میں ہوں، شب کے چند گھنٹے کی نیند کے سوا میں کبھی تنہا نہیں رہتا۔



بھیڑ بھاڑ ہی میں رہتا ہوں، لیکن اِس بھیڑ بھاڑ میں، شور و غل میں، ہنگاموں میں، مشاغل کی کثرت میں، کسی وقت نہ تھکنے والی اور نہ سُستانے والی مستقل متحرک اور باعمل زندگی میں میرا دل ہمیشہ تنہا رہتا ہے۔ میں خود کو اِس عالمِ ہاؤ ہُو کا فرد نہیں سمجھتا، میں کسی اور انجمن سے نکلا ہوا یا نکالا ہوا خانہ برباد محسوس ہوتا ہوں جو اِس محشرِ واردات و حادثات میں ہر وقت خود فراموش نظر آتا ہے۔

تیرا درد اتنا بڑا حادثہ ہے　　　کہ ہر حادثہ بھول جانا پڑے ہے

جانی پہچانی صورتوں کے درمیان بھی اجنبی اجنبی سا لگتا ہوں۔

بچی ہوئی ہے محبت کی آبرو ہم سے　　　ہم اِس زمانے میں اگلے زمانے والے ہیں

رُوح کی اِسی تنہائی کا ردِّ عمل میرے اشعار یا غزلیں ہیں۔ ان سے جو لطف میں لیتا ہوں، جو روشنی، جو قوت، توانائی میں حاصل کرتا ہوں وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔

دھوپ کہیں جب دھوپ نہیں ہو رات کہیں جب رات نہیں
دیوانوں کی بات سمجھنا سب کے بس کی بات نہیں

پھر مجموعے کی اشاعت اور تشہیر کا کیا حاصل ہے؟ اور اِس کے لئے دردِ سر کیوں مول لیا جائے ــ؟ حال تو یہ تھا کہ ایک پُرزہ پر لکھا اور پھینک دیا۔ کبھی کسی ڈائری پر لکھ لیا، کبھی کسی کتاب پر، کبھی کسی کاپی پر۔ مشاعروں کی شرکت بھی کسی حد تک ناپسند ہے، خاص خاص حالات میں شریک ہوتا ہوں۔ لوگ مجھے مشاعرے میں پڑھتے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں، میں تو مشاعروں میں بھی خود کو



تنہا ہی محسوس کرتا ہوں۔ جس طرح تنہا ملاح دریا میں پتوار چلاتا ہوا گیت گاتا ہوا گذرجاتا ہے، میں بھی جذبات کے سمندر میں دل کی کشتی کو غزل کے پتوار سے کھیتا ہوا نکل جاتا ہوں۔

کبھی یہ بھی سوچتا کہ شاعری زندگی کی امانت ہے، فرد ختم ہوجاتا ہے زندگی ختم نہیں ہوتی، تو میں حیات کی اس امانت کو اپنے وجود کے ساتھ کیوں فنا کردوں؟ اِسے بے شک دوسروں کو سونپ دینا چاہئے۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی ساتھ یہ چُبھن پیدا ہوتی رہی کہ میرؔ نے :

مجھکو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے   دردو غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

کہکر اِس خطرے سے بچنے کے لئے "ذکرِ میرؔ" لکھ دیا۔ اقبالؔ بہت کچھ کہہ گذرنے کے باوجود یہ گلہ کرگئے :

آشنائے من زمن بیگانہ رفت   از خمستانم تہی پیمانہ رفت

کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید   آشکارم دید پنہانم نہ دید

تو بیتابیٔ جاں کی کچھ جھلک دِکھانی بھی ضروری ہے۔ "ذکرِ میرؔ" لکھنے کی میرؔ کو فرصت تھی وہ ہمیں کہاں نصیب؟ جس طرح ذکرِ میرؔ کے بغیر میرؔ کی صحیح پہچان اور اُس کے فن کی عظمت تک رسائی نہیں ہوسکی، اِسی طرح کلیمؔ کی بکواس کی صحیح لذّت آشنائی کے لئے ذکرِ کلیمؔ کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس کیلئے نہ قلم میں بھرپور صلاحیت، نہ اُمنگوں میں سکت، نہ قلب میں طاقت۔ اتنا کہکر گذرجانا :

بکنے بھی دو عاجزؔ کو جو بولے ہے بکے ہے

دیوانہ ہے دیوانے سے کیا بات کرو ہو



مشاعروں میں آسان ہو تو ہو، سیاہ و سفید کی دُنیا میں مشکل ہے۔ اور پھر میرؔ نے "ذکرِ میرؔ" بھی اپنے کلام کے فہم کے لئے ناکافی سمجھا۔ اور جب چند نہایت باذوق حضرات میرؔ کی خدمت میں اشتیاقِ کلام لیکر آئے اور سُنانے کی درخواست پیش کی تو میرؔ نے بہت اصرار کے بعد جواب دیا کہ "میاں! تم ہمارا کلام نہیں سمجھ سکتے۔" تو ان بے چاروں نے عرض کیا کہ حضرت! عرفیؔ خاقانیؔ نظامیؔ قاآنیؔ کا کلام سمجھتے ہیں، آپ کا کلام کیوں نہیں سمجھ سکتے؟ میرؔ نے کہا "ان شاعروں کی فرہنگیں اور شرحیں ہیں، میرے کلام کی شرحیں اور فرہنگیں جامع مسجد کی سیڑھیاں ہیں جہاں نادر شاہ کی تلوار چمکتی رہی اور جب شہر بھر سے شرخیاں بڑھ کر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک آگئیں تب نیام میں گئی۔ اُن سیڑھیوں کو مستقل مسکن بناؤ تو میرا کلام سمجھوگے" ــــ تو میرؔ صاحب کے زمانے میں تو جامع مسجد کی سیڑھیاں تھیں اور اب تک ہیں۔ میں ستائیس۲۷ سال پہلے کے تیلہاڑہ کی سنگی مسجد کی سیڑھیاں، عیدگاہ کی محرابیں، پیر یوسف ابدال کا قبہ، پاکڑ کا درخت، برگد کی چھاؤں، سنگرہار کی ٹہنیاں، اُونچی چہار دیواری کے اندر گھرے ہوئے امرود اور شریفے اور جامن کے درخت کہاں سے لاؤں؟ ان کی نازک شاخوں میں نازک جھولے اور اُن پر جھولنے والوں کی آبشار جیسی ہنسی کی کھنکھناہٹ ایک دن ہمیشہ کے لئے فضا میں گُم ہوگئی۔ جن کی صورتیں ایک دن خاک میں مل جانے کے بعد پھر کبھی لالہ و گل میں نمایاں نہ ہو سکیں ــــــــــــ میں یہ سب کہاں سے لاؤں جہاں اپنے کلام کے سُننے والوں کو جانے کی ترغیب دے سکوں؟



جی میں ہے کہ روئیے شاخِ سایہ دار میں　　　دونوں ہاتھ ڈال کے گردنِ بہار میں

ہم لُٹے تو کیا رہے ہم ہیں کس شمار میں　　　قافلے کا قافلہ لُٹ گیا بہار میں

بہرحال، تو مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے بھی کچھ لکھنا تھا۔ اور یہ "کچھ" بھی اتنا ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل کتاب چاہئے۔ میرے دل کی تہوں میں لامتناہی سلسلۂ داستان ہے، جس کے تمام مناظر اور ہر منظر کے تمام اجزا میرے دل کے نگار خانے میں متحرک تصویروں کی طرح آویزاں ہیں۔ یہ تصویریں چلتی پھرتی ہیں، آپس میں ملتی جلتی ہیں، باتیں کرتی ہیں، میں ان کی آوازیں سُنتا ہوں، ان کی سرسراہٹیں محسوس کرتا ہوں۔ یہی میرے ہم نشیں ہیں، میری ہم جلیس اور ہم نوا ہیں۔

یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں

یہی میرے دن کے رفیق ہیں، یہی میری رات کی رانیاں

یہ مجھ سے کبھی جُدا نہیں ہوتیں۔ خلوت جلوت میں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی قُربت سے مجھے تقویت ہے، مجھے ڈھارس ہے، سہارا ہے۔ انہی کی رفتار و گفتار، اشاروں اور کنایوں کو میں اپنے اشعار میں منتقل کرتا ہوں۔ اپنے روزانہ کے تجربات اور مشاہدات سے ان کا رشتہ جوڑتا رہتا ہوں۔ یہ میرے معلمین بھی ہیں اور معاون بھی۔ یہ تجربوں اور مشاہدوں کی ترتیب اور ترکیب اور تنظیم و تزئین میں میری مدد کرتی ہیں۔ روزانہ کے منتشر واقعات میں منطقی ربط پیدا کرتی ہیں۔ یہی میری رہبری اور رہنمائی کرتی ہیں۔



میں اپنی والدہ کی لکھائی ہوئی ایک یادداشت کے مطابق ۱۱؍اکتوبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوا۔ اوسط درجے کا کھاتا پیتا خوش حال گھر تھا۔ میری نسلی روایات میں دو دھارائیں ہیں۔ میری نانیہال صوفیوں اور مولویوں کا خاندان ہے، میر اکبر علی میرے پرنانا کے دو لڑکے مولوی امیرالدین اور مولوی ضمیرالدین، یہ خاندان اپنی خصوصیاتِ مزاج کے اعتبار سے منفرد تھا۔ منکسر مزاجی، وسیع المشربی مرنجاں مرنجی، گوشہ گیری، بے لوثی، خاموشی کم ہوگئی یہ میں نے اپنی نانیہال کے ہر فرد میں دیکھی۔ میری پرورش نانیہال ہی میں ہوئی۔ میری دادھیال دیہاتی زمینداروں اور کاشتکاروں کا خاندان تھا۔ اس خاندان کا ہر فرد سپہ گیری میں ممتاز تلوار باز اور لٹھیل تھا۔ جوانمردی اور ہر وقت مارنے مرنے پر تُلے رہنے میں مشہور۔ میرے دادا شیخ بدرالحسن اور اُن کے بڑے بھائی شیخ سخاوت حسین پورے علاقہ میں ایک طلسماتی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں جو روایات ان دونوں کے سُنیں وہ واقعی طلسماتی ہی تھیں، جنوں اور بھوتوں سے کشتیوں کی روایات عام تھیں، ہزاروں دُشمنوں کے مجمع میں دونوں بھائی تلواریں سونت کر گھُس جاتے تو مجمع کا پتہ نہ رہتا تھا۔ میں نے دونوں میں سے کسی کو نہ دیکھا۔ اپنے والد کو دیکھا جو میری نانیہال یعنی اپنی سُسرال میں رہ گئے۔ بدن ہاتھ اور صحت و توانائی کے اعتبار سے واقعی ایسے ہی باپ کی اولاد معلوم ہوتے تھے۔ بہت خوش رُو اور طاقت ور۔ میں اپنی نانیہال تیلہاڑہ میں جو پٹنہ کے نواح میں قدیم شرفاء کی ایک بہت ہی اہم اور ممتاز بستی تھی پیدا ہوا اور پلا۔ میری ابتدائی معلمہ میری والدہ تھیں۔ میرے نانا مولوی ضمیرالدین نے ابتدائی تعلیمی

ذمہ داری سنبھالی۔ مولوی صاحب اُس علاقے کے باعزّت صاحب علموں میں تھے اور علاقے کے ہندو مُسلم شرفا کے لڑکے ان کے یہاں مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ علم کے ساتھ تہذیب شائستگی، آدابِ نشست و برخاست، آدابِ گفتگو معاملات اور تعلقات کا گہوارہ ان کی ذات تھی۔ عربی بقدرِ ضرورت، فارسی اور اُردو میں بے مثال مہارت تھی۔ مردان خانہ کے سائبان میں دُور تک چوکی اس پر چٹائی اور چاندنی کا فرش، ایک کنارے پر مولوی صاحب مصلّٰی بچھائے دیوار سے ٹیک لگائے آنکھ بند کئے بیٹھے ہیں اور چوکی پر دونوں طرف طلبا کی قطار ہے جس میں اُردو کے قاعدہ سے مثنوی یوسف زلیخا، انشائے خلیفہ، سکندر نامہ اور بہار دانش کے طالب العلم ہوتے۔ کسی لڑکے نے کسی کتاب کا ایک لفظ غلط پڑھا اور مولوی صاحب نے آنکھ بند ہی کئے ہوئے زور سے ڈانٹا "کیا پڑھ رہا ہے دیکھ کے پڑھ!" حالانکہ بیچارہ دیکھ کر ہی پڑھ رہا تھا۔ مگر کوئی کتاب نہ تھی جو مولوی صاحب کو لفظ بلفظ یاد نہ ہو۔

میں سات سال کی عُمر میں مکتب میں بیٹھا۔ میرے نانا مولوی ضمیر الدین صاحب جس طرح اور طلبار کو پڑھاتے بالکل اُسی طرح مجھے بھی انھی طلبار کے درمیان بٹھایا گیا، کسی پہلو سے کوئی امتیاز نہ تھا۔ یہ بات کسی فخر اور امتیاز کے جذبے سے نہیں کہی جارہی ہے، لیکن اظہار امر واقعہ ہے کہ میری ذہانت اور میرا حافظہ عجیب و غریب تھا۔ کسی سبق کو دوبار سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی ــ ساتویں سال میں قاعدہ بغدادی سے شروع کر کے پارۂ عم، اُردو کی ابتدائی کتابیں، آمدنامہ، نسخہ تعلیمہ،

رقعات عزیزی، گلستاں، بوستاں اور یوسف زلیخا پر پہونچا تو میرا دسواں سال شروع ہو رہا تھا۔ اور اس تین سال کی مدّت میں نصاب کی فارسی کتابوں کے ساتھ نانا کے چھوٹے سے ذاتی کُتب خانے کی اکثر کتابیں مطالعہ میں آچکی تھیں۔ قصص الانبیاء جو بہت بڑے تقطیع پر تھی، کئی بار پڑھ چکا تھا۔ مراۃ العروس، بنات النعش، ابن الوقت اور توبۃ النصوح ایک ہی جلد میں تھیں۔ اور یہ کتابیں بھی اپنی بڑی بہن کے ساتھ راتوں کو ساتھ بیٹھ کر کئی بار پڑھ چکا تھا۔ یہیں مجھے اپنے نانا ہی کے قلم سے نقل کیا ہوا صوبۂ بہار میں لکھا ہوا مشہور ناول "فسانۂ خورشیدی" ملا۔ جسے ہم بھائی بہن نے ایک درجن بار پڑھا ہوگا۔

میرے والد جو کلکتہ میں تجارت کرتے تھے، مجھے کلکتہ بلانے پر مُصر تھے اور میں گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ گھر سے مجھے کس قدر محبت تھی اس کا ہلکا سا نقشہ آئندہ آئے گا۔ میں دسویں سال کلکتہ گیا۔ والد صاحب اپنے خاندانی روایات کے بڑی حد تک حامل تھے۔ وہ کہتے "کلیم کو صرف مولوی یا صوفی نہیں بننا ہے اِسے پہلوان بھی بننا ہے"۔ چنانچہ اُسی عمر میں انھوں نے کلکتہ کے دو مشہور پشاوری پہلوان دوستوں کے مجھے حوالے کیا۔ محمد نواب پہلوان اور فیروز پہلوان جو چھوٹے گاما کے عزیز تھے۔ گوسوامی جی کے اکھاڑے میں یہ دونوں حضرات کلکتہ کے تمام پہلوانوں کے گرو تھے۔ روزانہ صبح اکھاڑے میں مجھے لے جایا جاتا۔ کبھی نواب پہلوان کبھی فیروز پہلوان مجھے زور کراتے۔ زور کیا کراتے، کچھ ڈنڈ بیٹھک کے بعد اکھاڑے میں لیکر کودتے اور مٹّی پر دیر تک خود گرتے اور مجھے گراتے۔ والد صاحب کو

اِس پہلوانی کی نسبت سے کھانے اور کھلانے کا جنون تھا۔ اور مجھے اس کے برعکس ہمیشہ کھانے کی زیادتی سے نفرت رہی۔ چاروں وقت گھی دُودھ اور میوہ جات کی بھرمار رہتی اور مجھے اِن تینوں چیزوں سے غایت بے رغبتی۔ گھی نظر بچاکر اُگال دان میں ڈال دیتا، دُودھ کچھ پیتا کچھ چُپکے سے چَوکی یا الماری کے اندر چُھپا دیتا جو بعد میں ملازمین کی ضیافت کا سامان بنتا۔ کبھی والد صاحب دیکھ لیتے تو ایسی پٹائی ہوتی کہ میں اب تک نہیں بھُول سکا ہوں۔ وہ چند باتوں سے بے حد خفا ہوتے۔ جھوٹ سے اُنہیں سخت عداوت تھی، کھانے کے متعلق میں اکثر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا اور وہ مجھے پیٹنے پر مجبور ہوتے۔ وہ حصولِ علم کے اتنے شوقین نہ تھے جتنے حصولِ صحت اور طاقت کے۔ کلکتہ کی رہائش میرے لئے عذابِ جان تھی۔ ویسے والد صاحب اور معاملات میں بے حد شفیق اور مہربان، بالخصوص کھلانے اور پہنانے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ کھانے سے مجھے کبھی رغبت نہ رہی لیکن کپڑوں کا شوق مجھے انہوں نے ہی بخشا۔ خوش پوشی ابتدائے زندگی سے میرے ساتھ رہی۔

کلکتہ کے قیام، گھر کی دُوری اور والد صاحب کی سخت اُصول پرستی نے ردِّ عمل کے طور پر مجھ میں دو چیزیں پیدا کر دیں ——— مطالعہ اور تماشہ بینی۔ مطالعہ کی ابتدا تو مکتب کی تعلیم کے دَوران گھر ہی میں ہو گئی تھی۔ کلکتہ میں اس کے لئے مزید راستے کھُل گئے۔ میں ذہین تھا مگر ترتیب کے ساتھ تعلیم میرے مزاج کے خلاف تھی۔ والد صاحب نے انگریزی اور حساب کے لئے ایک اسکول کے ماسٹر پنڈت تر پاٹھی کو مقرر کیا تھا جو بڑی محنت سے پڑھاتے، لیکن انگریزی اور حساب

کے معاملے میں شروع سے پرشوق رہا۔ گرچہ آیندہ اسکول کے امتحانات میں دونوں میں بہت اونچے نمبر لاتا رہا مگر ابتدا میں پنڈت جی بھی مجھے خوب پیٹتے، وہ بات بات پر کان بہت اینٹھتے تھے، مگر پھر بھی انگریزی اور حساب کی تعلیم کی طرف میرا شوق منتقل نہ ہوا۔ اردو رسالوں اور کتابوں کا شوق نہیں جنون تھا۔ میں سوچتا ہوں تو یقین ہوتا ہے کہ میری عمر کا شوقینِ اردو کلکتہ کے غدار شہر میں بھی شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک تین سال میں دس سے تیرہ سال کی عمر تک صبح اٹھنے سے رات کے گیارہ بجے تک مستقل چھپ چھپ کر میں مطالعہ ہی میں مشغول رہتا۔ اس زمانے کے تمام اچھے رسالوں کے ماہانہ اور تمام خاص نمبر میرے مطالعہ سے نہ بچے۔ "عالم گیر" لاہور۔ حکیم یوسف حسین صاحب کا "نیرنگ خیال" لاہور۔ میاں بشیر الدین کا رسالہ "ہمایوں"۔ "ساقی" دہلی۔ "ادبی دنیا" دہلی۔ جوش ملیح آبادی کا حسین رسالہ "کلیم"۔ اختر شیرانی کا رسالہ "رومان"۔ اس زمانے میں میرے محبوب افسانہ نگار پریم چند، ایم اسلم، پنڈت سدرشن تھے۔ دوسرے لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، اشرف صبوحی، مرزا محمد شفیع دہلوی، ظفر قریشی، ناکارہ حیدر آبادی، تمکین کاظمی، امین سلونوی، نسیم انہونوی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی، مرزا فرحت اللہ بیگ وغیرہ اور نہ جانے کتنے تھے جن کا نام مجھے اب چند برسوں سے یاد نہیں رہا۔ سعید احمد تاجر کتب سندریہ پٹی کلکتہ سے سینکڑوں روپئے کی کتابیں خریدیں۔ الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا کی ساتوں جلدیں، ایرج نامہ تورج نامہ وغیرہ۔ مجھے یاد ہے کہ طلسم ہوش ربا کی اوّل سے چوتھی جلدیں

تو میں نے ایک بار ہی پڑھیں، لیکن پانچویں، چھٹی اور ساتویں جلدیں یاد نہیں کتنی بار پڑھیں۔ پہلی
چاروں جلدوں کے مصنف غالباً منشی محمد حسین جاہ تھے۔ میں یہ تمام باتیں اِس وقت آج سے تقریباً
پینتیس چھتیس سال پہلے کی یادداشت کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ پانچویں، چھٹی اور ساتویں جلدوں
کے مصنف منشی احمد حسین قمر تھے۔ جاہ سے زیادہ تخلیقی فنکاری قمر میں تھی۔ اس لئے قمر کی واقعہ
نگاری میں زیادہ پیچیدگی اور شگفتگی تھی، داستان کے دَوران نظموں، غزلوں اور قطعات و
رباعیات کا استعمال بھی زیادہ برمحل اور خوش ذوقی کی بُنیاد پر تھا۔ انہی داستانوں میں مجھے
لکھنؤ کے اساتذۂ سخن سے آشنائی ہوئی۔ اور اِسی ذریعہ سے میری توجہ اُردو شاعری کے مطالعے کی
طرف ہوئی۔ خیر الدولہ قبولؔ اور آفتاب الدولہ قلقؔ کی مثنویاں، جلالؔ، خلیلؔ، تعشقؔ وغیرہ کی غزلیں
اُردو شاعری کی طرف متوجہ کرنے لگیں اور میں نے تمام دیوان خریدے۔ مصحفیؔ، انشاؔ، ناسخؔ، رندؔ،
صباؔ، خواجہ وزیرؔ۔ پھر ان کے ساتھ داغؔ اور امیرؔ کے تمام مجموعے۔ پھر تذکرہ گل رعنا، تذکرہ
نساخ اور خدا جانے کون کون کتابیں نظموں اور نثر کی۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے بے شمار
انگریزی ناول کے اُردو ترجمے۔ یہ تمام دیوان، رسالے، کتابیں تین سال ۱۹۳۴ء سے ۳۷-۱۹۳۶ء
میرے مطالعے میں آئیں۔ مطالعے کے مشاغل دُوریٔ وطن کی تپش، گھر کی محبت اور ماں کی محبت
کے سوز میں کچھ کمی کر دیتے تھے۔ مگر ان سے بھی تشفی نہ ہوتی تھی اور میں ماں کی جُدائی اور گھر کی دُوری
کے غم کو کبھی کبھی آنسوؤں کے وسیلے سے کم کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ والد کے ملازمین بھی مجھ سے بہت

محبّت کرتے تھے۔ وہ مجھ پر ترس کھا کر مجھے تماش بینی کی طرف راغب کر رہے تھے، چنانچہ اُنہی کے ذریعے میں کلکتہ کی دو مشہور تھیٹریکل کمپنیوں سے روشناس ہوا۔ الفریڈ تھیٹر اور الفنسٹن تھیٹر۔ یہ دونوں کمپنیاں بہت بڑے پارسی تاجر سر جہانگیر جی رستم جی کی تھیں اور میرے خیال میں ہندوستان کی تمام تھیٹریکل کمپنیوں میں اُس زمانے میں ممتاز تھیں۔ اسی الفنسٹن تھیٹر میں مجھے ایک شب ۱۹۳۶ء میں اُردو دُنیا بلکہ ہندوستان کے سب سے ممتاز ڈرامہ نگار آغا حشر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ الفنسٹن تھیٹر کے سائبان میں ایک بہت بڑا گروہ خوش پوش بوڑھوں اور جوانوں کا کسی کے گرد جمع تھا، میں بھی کسی طرح حلقے کے اندر داخل ہو کر بالکل اگلے دائرہ میں آگیا ——— دیکھا ایک حسین شخص تقریباً ساٹھ سال کی عُمر، سرخ و سپید رنگ چھوٹی چھوٹی مونچھیں داڑھی منڈی ہوئی۔ سر پر سیاہ و سفید بال، سیاہ فریم کی عینک، بادامی ریشمی قمیض جس میں سونے کے بٹن کے ساتھ نازک طلائی زنجیر مع جھالر لٹک رہی تھی، سیاہ گرم کوٹ اور سفید شلوار کا ریشمی گلابی ازار بند جھول رہا تھا۔ پاؤں میں بادامی پیٹینٹ کی سلیپر، ہاتھ میں کوئی کھُلی کتاب تھی اور مُسکرا کر کچھ شعر پڑھ رہے تھے۔ ایک شعر مجھے اب تک اِس طرح یاد ہے ؎

ستارے ہیں کہ چھینٹیں بادۂ احمر کی اُڑتی ہیں
کہاں سے اے قمر تو نے یہ جامِ آتشیں پایا

میں نے بھی سلام کیا اور جواب کے ساتھ میری طرف وہ خصوصی طور سے متوجہ ہوئے۔ توجّہ کی

میرے خیال میں ایک وجہ تو میری وضع ہوگی جو کلکتہ میں اُس وقت بہت ممتاز تھی۔ گیا کی ترشی
سلی اور دُھلی ہوئی پلّے کی سفید ٹوپی، سیاہ شیروانی، لٹھّہ کا خالتہ پاجامہ اور سیاہ پٹنٹ کا پمپ،
عُمر تو میری گیارہ سال تھی مگر کُشتی کی واجبی محنت سے ہی قد و قامت اور بدن خاصہ نکل آیا تھا،
میں حشرؔ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اُن کے ڈرامے اُن کی ادبی اور شاعرانہ شخصیت کا
پرتو ہیں۔ الفنسٹن اور الفریڈ تھیٹریکل کمپنیوں میں اُس دَور کے ڈراموں کا ادبی معیار قابلِ
رشک تھا۔ بالخصوص آغا حشر کے ڈرامے ویر بالک، پریمی بالک، دھرمی بالک، بھارتی بالک۔
یہ چار ڈرامے ہندوستان کی سودیشی تحریک کی ڈرامائی تصویریں تھے جن میں آغا حشرؔ کی فنّی،
ادبی اور شاعرانہ صلاحیتیں عروج پر تھیں۔ پھر ان کے ساتھ "بھگت سورداس"۔ "بلوا منگل"۔
"آنکھ کا نشہ" اور اُن کا آخری اسٹیج ڈرامہ "دل کی پیاس" جو ۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ کھیلا گیا، جو
دو سال تک مستقل کھیلا جاتا رہا۔ کلکتہ کی ادبی فضا میں آگ لگا گیا۔ ان ڈراموں اور ان کے ساتھ
منشی محی الدین نازاںؔ لکھنوی، منشی شاہجہاں شمسؔ لکھنوی، منشی نرائن پرشاد بیتابؔ، منشی رحمت علی رحمتؔ
بنارسی کے اُردو ڈراموں کی ادبی توانائیاں اور ساتھ ساتھ اس دَور کے اسٹیج ایکٹروں۔ محمد نواب کشمیری
محمد آغا جانی بیدلؔ کشمیری، منشی عزیز الحسن دلؔ لکھنوی، مسٹر محمد خلیق مستحسنؔ، ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر
موہنؔ، مسٹر منی لال کھپتی، مسٹر سہرابؔ جی کیرو والا، مسٹر کاؤس جی پھٹکی، مسٹر دادا بھائی سرکاری،
یہ تماش بینی سے تعلق رکھنے والی شخصیتیں۔ یہ اسٹیج کے بہروپیے کردار کے اعتبار سے اتنے بلند، نفاست

لیاقت، متانت، شرافت، تہذیب، شائستگی اور ساتھ ساتھ علمی صلاحیت، ادبی ذوق کے اتنے اونچے مقام پر نظر آتے تھے کہ مجھے اِس دَور میں خانقاہوں، تعلیم گاہوں اور تہذیبی اداروں کے نمایاں افراد بھی اس مقام پر نظر نہیں آتے۔ میں شب کو تھیٹر میں ان شخصیتوں کو مختلف بہروپ میں دیکھتا۔ اور صُبح ان کی کشش مجھے تھیٹر کی عمارت کے سامنے لے جاتی اور میں دیر تک عمارت سے ان لوگوں کے برآمد ہونے کا منتظر رہتا۔ اپنی اصل شکل وصورت میں یہ بالکل مختلف نظر آتے۔ سنجیدہ، خاموش، وضع قطع کے بے تکلف، تصنّع اور بناوٹ سے منزلوں دُور۔ اِن میں کے اکثر مجھے پہچان گئے تھے وہ مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے مخاطب ہوتے۔ اور کبھی نواب کشمیری کہتے کہ بیٹا! تھیٹر نہ دیکھا کرو اور ہم گنہگاروں سے دُور رہو۔ تو آج میری نگاہوں میں وہ بہروپئے 'اصل' اور آجکل کے اصل بہروپئے نظر آتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا پس وپیش نہیں کہ ادب اور شاعری کے ذوق کا بہت بڑا حصّہ مجھے تھیٹریکل ڈراموں سے ملا اور طبیعت کی نفاست، وضع کی متانت، خیال کی سنجیدگی اور دل کے گداز کا ایک خاصہ حصّہ ان بہروپیوں سے حاصل ہوا۔

میرے مزاج اور طبیعت کی تشکیل اور تزئین میں کلکتہ کا بڑا دخل ہے۔ مطالعے کا وافر سامان ابتدا میں وہیں حاصل ہوا۔ مطالعے کے ذریعہ جو مواد حاصل ہوتا تھا اُسے مزاج میں اور رُوح میں جذب کرلینے کی صلاحیت تماش بینی اور دُنیائے تماشہ کی ان بزنام شخصیتوں سے روابط اور تعلق کی بنا پر

پیدا ہوئی اور پھر اس میں جلا اور آراستگی کلکتہ ہی کے شعر و ادب کی فضا میں میسر ہوئی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء، تین سال کلکتہ کی ادبی اور شاعرانہ فضا سے قربت اور ہم آہنگی کا دور ہے۔ اسلامیہ کالج، کلکتہ کا ادبی مرکز تھا۔ زکریا اسٹریٹ، کولوٹولہ اسٹریٹ، ویلیسلی اسٹریٹ، پارک سرکس اور ہوڑہ اس ادبی مرکز کی شاخیں تھیں۔ کلکتہ کے دو حلقے تھے۔ علامہ وحشت کلکتوی کا حلقہ اور منشی آرزو لکھنوی کا حلقہ۔ جمیل مظہری، عباس علی خاں بیخود، آصف بنارسی، واصف بنارسی وغیرہ حضرت وحشت کے شاگردوں میں اور جرم محمد آبادی، جواں سندیلوی وغیرہ حضرت آرزو کے حلقہ بگوشوں میں تھے۔ اور ایک تیسرا حلقہ عظیم آبادی تھا۔ پرویز شاہدی، ہُدہُد عظیم آبادی وغیرہ۔ اور ایک چوتھا حلقہ جو ان تینوں حلقوں کو نمایاں کرتا تھا، محمود طرزی، مسعود صابری، ظفر تبریزی، عنایت دہلوی وغیرہ پر مشتمل تھا۔ یہ صحافی بھی تھے، ادیب بھی اور شاعر بھی۔ میں ان حلقوں سے متعارف پہلی بار غالباً ۳۶ء یا ۳۷ء کے ایک مشاعرہ اور کانفرنس میں ہوا۔ غالباً علامہ جمیل مظہری کے زیر انتظام یہ کانفرنس ہوئی تھی۔ نواب سلیم اللہ خاں ڈھاکہ، سر عبد الرحیم، شیر بنگال فضل الحق، مولانا شوکت علی، خواجہ حسن نظامی، پنڈت سدرشن، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، مولانا حسرت موہانی اور کلکتہ کے تمام اساتذہ اور شعراء کو پہلی بار یہیں سننے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور مشاعرہ سے پہلی شناسائی اور آگاہی اسی میں نصیب ہوئی اور پھر یہ سلسلہ چلا۔ مختصر یہ کہ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۹ء تک دسویں سال سے پندرہویں سال تک جب میں نے پہلی بار اسکول کے نویں درجے میں قدم رکھا تو چھ سال کی مدت میں اتنا کچھ میں نے دیکھ لیا تھا،

سُن لیا تھا، محسوس کر لیا تھا، دل میں بھر لیا تھا اور طبیعت اور مزاج میں اُتار لیا تھا۔ جو شاید ایک عمر گذار کر بھی اکثر حاصل نہیں ہوتا۔ یہ سرمایہ علم کے اعتبار سے تو کچھ خاص نہ تھا، لیکن طبیعت اور مزاج کی تشکیل اور تربیت کے اعتبار سے بہت کچھ تھا۔ اس چار پانچ سال میں باہر کی دُنیا سے علم تجربہ اور مشاہدہ کی شکل میں جو کچھ ملتا رہا گھر کے ماحول میں ماں بہنوں بُزرگوں رشتہ مندوں کے جھُرمٹ میں جب طبیعت پھُول کی طرح کھلی ہوئی ہوتی، مزاج اور فطرت کا سانچہ کھُلا ہوا اور کشادہ ہوتا، تو ان معلومات، تجربوں اور مشاہدوں کو سانچوں میں ڈھلنے کا موقع ملتا۔ وہ زندگی کی قدروں میں تبدیل ہوتے، رُوح میں سرایت کرتے اور رگ و پے میں لہُو بن کر دوڑنے لگتے۔

جب ۱۹۳۹ء میں اسکول میں داخل ہوا، تو کلاس کے ساتھیوں میں مجھے اجنبی پن سا محسوس ہوتا۔ نہ مجھے اُن کی گفتگو میں مزہ آتا، نہ اُن کے مشاغل اور عادات و اطوار میں کشش معلوم ہوتی۔ میں کلاس میں سب سے پیچھے گوشے میں بیٹھتا، تاکہ ماسٹر صاحب کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ اور کلاس سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرہ میں تنہا رہتا۔ نہ میری کسی سے کوئی خاص دوستی، نہ مراسم نہ تعلقات۔ بس واجبی واجبی صاحب سلامت ۔ وضع قطع رکھ رکھاؤ نشست و برخاست، ہر لحاظ سے میں کچھ الگ تھلگ نظر آتا۔ پڑھنے کی طرف کچھ خاص میلان نہ تھا۔ لیکن حافظے اور ذہن کی تیزی اور ذوق کی لطافت اور کسی حد تک پختگی امتحانات میں کام آجاتی۔ اسکول کے ریکارڈ میں ہے کہ پہلے سال یعنی نویں درجہ کے امتحانات میں مجھے اسکول میں تیسری جگہ ملی۔ دسویں کلاس میں دوسرا مقام اور

اِنٹرنس میں اپنے اسکول میں اوّل اور پورے صُوبے میں پانچویں پوزیشن تھی ۔ بچپن کی تعلیم، ابتدائی زندگی کے شوقِ مطالعہ اور کلکتہ کے ادبی، شعری اور ڈرامائی ماحول نے جہاں ادبی ذوق اور شعری میلان کی خاموش چنگاریاں مجھے بخشیں، وہیں زندگی کی بُنیادی قدروں سے والہانہ محبت بھی عطا کی۔ دل میں ایسا گُداز، طبیعت میں ایسی رقّت پیدا کردی، جو اُس دَور میں بھی عجیب وغریب چیز معلوم ہوتی تھی۔ اور آج کا کیا پوچھنا۔ طبیعت ذراسی بات پر کھل اُٹھتی اور ذراسی بات پر بھر آتی ۔ مجھے گانے اور دوسروں کی غزلیں گنگنانے کا بھی بے حد شوق تھا۔ لیکن حال یہ تھا، کہ کوئی گیت یا کوئی غزل ابھی لحن سے شروع کی اور آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے گرنے لگتے۔ میں نے اس عجیب غریب کیفیت کا بزرگوں سے اور اپنی قرابت کے خاندانی صوفیوں سے بھی ذکر کیا، لیکن کہیں سے کوئی خاص تشفی بخش جواب نہیں مل سکا۔ اپنے قریب کی تمام شخصیتوں سے اور اُن شخصیتوں کے ماحول سے ایسی والہانہ محبت اور شیفتگی مجھ میں پیدا ہوگئی کہ اس کی مثال شاید مجھے کبھی کبھی افسانوں اور داستانوں میں ملتی ہے، اپنے دَور کے انسانوں میں نہیں ملتی۔ میرے گھر میں نانا جان ۔ والدہ۔ بڑی اور چھوٹی بہنیں چھوٹے بھائی تھے۔ جب میں اسکول کے لئے گھر سے کلکتہ یا پٹنہ روانہ ہونے والا ہوتا تو ہفتہ پہلے سے ہی مارے دہشت اور ہول کے میری طبیعت خراب ہوجایا کرتی۔ کبھی بخار آجاتا کبھی دست آنے لگتے۔ کبھی اختلاج اور رونے کا دَورہ پڑجاتا۔ کبھی ایسی بات ہوتی کہ مجبوری مجھے ایک حد تک زبردستی کھٹولی پر سوار کر کے اسٹیشن روانہ کیا جاتا جو گھر سے تین میل کی مسافت پر تھا۔

جب گھر سے مجھے لے جایا جاتا، تو ماں اور بہنوں بھائیوں کو دیکھ کر روتا، کمرے کو دیکھتا صحن کو دیکھتا سائبان کو دیکھتا طاق اور الماریوں کو روشن دانوں کو حسرت سے دیکھتا۔ ہر قدم پر سوچتا کہ میری نظر اس دروازے پر آخری بار پڑ رہی ہے، اس دہلیز کو میں آخری بار دیکھ رہا ہوں، اس دہلیز پر میرا یہ آخری قدم ہے۔ جب دروازے سے نکلتا تو اپنی ماں اور بہنوں کو دیکھتا اور ڈھاڑیں مار کر روتا، میری بہنیں بھی رونے لگتیں۔ اسی طرح گلی راستے کو دیکھتا ہوا روانہ ہوتا۔ محلّے اور بستی کے لوگ بھی مجھے دیکھتے ہمدردی کرتے تعجب کرتے اور تسلّی بھی دیتے۔ ایک کھٹولی پر میں ہوتا، دوسری پر میرے نانا جان، جو مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آتے۔ جب ریل آتی، مجھے ملازمین ریل پر سوار کرتے، نانا جان کھٹولی پر ہی بیٹھے رہتے اور اُن کے ہونٹ ضبطِ گریہ میں تھرانے لگتے اور میں بے تحاشہ رونے لگتا۔ اسی عالمِ اضطراب میں کلکتہ یا پٹنہ پہونچتا تو ہفتوں اور مہینوں گذر جاتے تب کہیں طبیعت قابو میں آتی۔

جی نہ چاہے تھا جُدا ہو کے کہیں جانے کو
ہم نے معشوق بنا رکھا تھا میخانے کو

زندگیوں سے پیار اور شیفتگی کی یہ بھونڈی اور الھڑ لکیریں، یہ بے ترتیب اور غیر منظّم نقوش ہی میری طبیعت، میرے مزاج میلان کی جان اور رُوح بن گئے۔ انہی سے میری زندگی کا پہلے ڈھانچہ تیار ہوا، پھر اس پر گوشت پوست آئے، پھر یہ ٹھوس اور مضبوط ہوئے، پھر انہی سے

رنگ اور روغن آیا' لباس آیا' پوشاک آئی۔ پھر انہی سے زندگی کی ساری آرائشیں اور زیبائشیں رونقیں اور رعنائیاں آئیں۔ اور میری آیندہ کی اس وقت تک کی زندگی انہی کے سنوار اور بناؤ کا دوسرا نام ہے۔ محبّت اور پیار' شیفتگی اور وارفتگی یہی میری زندگی کا واحد تصور ہیں۔ یہی میری زندگی کا سب سے اُونچا آدرش ہیں'۔ یہی فلسفہ بھی اور یہی حقیقت ہیں۔ جس فضا اور ماحول میں محبت کرنا میں نے سیکھا اس ماحول میں محبت کی پچھلی داستانیں بھی تھیں اور موجودہ متحرک تصویریں بھی۔ میرے نانا دو بھائی تھے۔ مولوی امیرالدین بڑے اور چھوٹے میرے نانا مولوی ضمیرالدین۔ میں نے انہیں ان کے بُڑھاپے میں دیکھا اور ان کے لڑکپن اور جوانی کی داستانیں سُنیں۔ ایسے افسانے کہ دونوں بھائی ایک مکتب میں پڑھتے تھے۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھتے ایک ساتھ اُٹھتے ایک ساتھ چلتے ایک ساتھ سوتے ایک ساتھ کھاتے۔ سردیوں میں دونوں کے سروں پر دوشالے ہوتے، مگر دونوں اپنے اپنے دوشالوں کے پلّوں سے ایک دوسرے کو ڈھانپنے کی کبھی ناکام کبھی کامیاب کوششیں کرتے ہوئے دیکھے جاتے۔ گھر سے الگ الگ رکابیوں میں کھانا آتا، مگر دونوں بھائی پہلے ایک رکابی کا کھانا ختم کرتے پھر دوسری رکابی میں ہاتھ لگاتے۔ مولوی صاحب قمچیاں مارتے کہ دونوں اپنی اپنی رکابیوں میں کیوں نہیں کھاتے۔ یہ قمچیاں کھاتے مگر کھانا الگ نہیں کھاتے۔ قمچیاں کھاتے تو کھانا چھوڑ دیتے اور خاموش روتے اور آنسو بہاتے۔ جب قمچیاں رُک جاتیں تو پھر اُسی طرح کھانا شروع کرتے۔ مولوی صاحب نے اُکتا کر انہیں اپنی اپنی حالت پر چھوڑ دیا۔ دونوں نے شادیاں کیں لیکن دونوں بھائی

صرف شب کو چند گھنٹوں کے لئے جُدا ہوتے، ورنہ زندگی کے تمام معمولات میں دونوں ایک مشین کے دُو بازو یا ایک ترازو کے دو پلڑے کی طرح رہتے۔ میں نے اپنے بچپن میں ان کا بڑھاپا دیکھا۔ مولوی امیرالدین زیادہ تر کلکتہ میں قیام کرتے تھے، تجارت بھی تھی اور درس و تدریس بھی۔ اور میرے نانا مولوی ضمیرالدین مستقل اپنے گھر پر ہی رہتے، سال میں ایک دو بار بڑے بھائی گھر آتے۔ اسٹیشن میرے گاؤں سے تین میل دوری پر تھا۔ مولوی ضمیرالدین گاڑی آنے سے دو تین گھنٹہ پہلے ہی سے بستی سے باہر آدھ میل دُور لاٹھی ٹیکتے ہوئے جاتے اور اسٹیشن سے آنے والی راہ پر ٹکٹکی لگائے کسی درخت کے سائے میں بیٹھے رہتے۔ دُور سے مولوی امیرالدین صاحب کی کھٹولی کہاروں کے کندھوں پر نظر آتی اور یہ اُٹھ کر بے تحاشہ کھٹولی کی طرف آگے استقبال کے لئے لپکتے۔ مولوی امیرالدین اپنے چھوٹے بھائی کو "مولوی صاحب" کہا کرتے اور یہ "بھیّا" کہتے۔ دُور ہی سے چلّاتے "السّلام علیکم بھیا!" اور وہ کہتے "وعلیکم السّلام مولوی صاحب"۔ اور سواری سے اُتر جاتے اور دونوں کے بوڑھے چہروں پر آنکھیں جوان ہو جاتیں اور اُن میں وہ چمک اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ رقص کرتی نظر آتی اور چہرے یوں کِھل اُٹھتے جس طرح دو محبوب کی ملاقات پر چہروں کا عالم ہوا کرتا ہوگا۔ مولوی امیرالدین گھر آتے اور سامان میں سے ایک بقچہ نکالتے، "لیجئے مولوی صاحب یہ آپ کے لئے دُو کُرتے اپنے ہاتھ سے سی کر لایا ہوں۔ یہ لیجئے یہ دُو پاجامے ہیں اور لیجئے یہ دُو ٹوپیاں ہیں"۔ مولوی صاحب کھڑے سلام کرتے جاتے اور بھیّا بھیّا کہتے جاتے۔ اور پھر صُبح آتی دن آتے،

شام آتی، رات آتی اور دونوں اُسی طرح دیکھے جاتے جس کی تصویر مکتب والے واقعہ میں دکھائی گئی ہے۔ تمام دن اور رات کے بہت زیادہ حصّے تک دونوں کی باتوں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا، اُسی طرح بیٹھنا اُسی طرح ساتھ کھانا اُسی طرح آس پاس پلنگ پر سونا۔ جب مولوی امیرالدین رخصت ہوتے تو اُسی طرح دُور تک پہونچانے جاتے۔ مولوی امیرالدین کھٹولی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتے، مولوی ضمیرالدین تھراتے ہوئے ہونٹوں سے سلام کہتے اور کھٹولی روانہ ہو جاتی، مولوی ضمیرالدین دیر تک کھٹولی کو دیکھا کرتے پھر کچھ دیر خاموش سر جھکائے کھڑے رہتے اور آہستہ آہستہ بہت تھکے ہوئے نڈھال مسافر کی طرح واپس ہوتے۔

میں کلکتہ میں آٹھویں درجے میں تھا کہ مولوی امیرالدین سڑک عبور کرتے ہوئے کسی گاڑی سے ٹکرا کر گرے، کولھا ٹوٹ گیا بیہوش ہو گئے اسپتال گئے، کولھے پر تختہ لگا کر بنڈج کیا گیا۔ مولوی امیرالدین کو ہوش آیا تو مجھے مخاطب کر کے کہا "مولوی صاحب کو خبر نہ کرنا"۔ ایک ماہ ذی فراش رہے، کسی طرح لیٹے لیٹے خط لکھتے رہے۔ آخری دِنوں میں معذور ہو گئے تو مجھ سے کہتے کہ "مولوی صاحب کو خبر نہ کرنا"۔ حالت زیادہ خراب ہوئی۔ عالمِ نزع میں بھی دو ایک بار کہا "مولوی صاحب کو مت خبر کرنا"۔ اسّی سال کی عُمر میں کلکتہ ہی میں انتقال ہوا۔ خبر کیسے نہ کی جاتی۔ مولوی صاحب کو خبر ہوئی، باہر مردان خانے کے صحن میں مولوی صاحب عصا تھامے کھڑے تھے۔ خبر سُنتے ہی گرے اور بیہوش ہو گئے گود میں اُٹھا کر لایا گیا۔ مفلوج ہو گئے تھے۔ چند دن بیمار رہے پھر یہ بھی رخصت ہو گئے۔

میرے ایک چچا تھے سید کبیر الدین۔ موسیٰ بنی کے علاقے میں جنگل کے داروغہ تھے، بہت کم سخن آدمی۔ میری چچی بڑی ہنس مکھ اور بہت خوبصورت بھی، تیلہاڑہ میں ہی چند روز بیمار ہوئیں اور یک بیک چل بسیں۔ موسیٰ بنی خبر کی گئی کبیر چچا آئے۔ مجھے یاد ہے غالباً اسٹیشن سے سائیکل یا کھٹولی پر آئے۔ دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ انہیں دیکھ کر ان کے گھر والوں نے مرحومہ کی یاد میں زور سے چیخ کر رونا شروع کیا۔ کبیر چچا نے فوراً ڈانٹ کر سب کو خاموش کیا، جس گھر میں چچی کا انتقال ہوا تھا سیدھے اُس کمرے میں گئے۔ اُسی پلنگ پر بیٹھ گئے، چند منٹ بعد لیٹ گئے ـــــ اور دوسرے یا تیسرے دن مر کر اُٹھے۔ میرے پڑوس میں ایک مولوی جبّو صاحب تھے، خوبصورت گورے چٹے آدمی۔ سفید داڑھی سفید زلف، جہاں دیدہ سرد و گرم چشیدہ۔ انکے چھوٹے بیٹے کو استسقاء کا مرض ہوا۔ علاج ہوتا رہا مرض بڑھتا رہا۔ آخر دنوں میں بڑے تحمل اور ضبط سے بیٹے کے سرہانے بیٹھے رہتے، ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے۔ بچے کا انتقال ہوگیا، صحن میں ٹہلتے رہے جنازہ تیار ہوتا رہا، ساتھ قبرستان گئے، قبر کے کنارے کھڑے رہے تسبیح پڑھتے رہے۔ مٹی ڈالی جانے لگی، ہجوم تھا، کسی کی نظر پڑی کہ قبر کے کنارے کھڑے کھڑے یک بیک مولوی جبّو صاحب کہاں غائب ہو گئے۔ غُل ہوا کہ قبر میں گر گئے ہیں۔ بہت کافی مٹی ڈالی جا چکی تھی، نکالا گیا۔ لیکن چند دن بعد ہی دوسری قبر بغل ہی میں تیار کرنی پڑی۔

میرے والد بڑے خوش رو آدمی، تنومند، قوی ہیکل خوش وضع خوش پوشاک جامہ زیب

معمولی پڑھے لکھے مگر تہذیب شرافت دینداری انسان دوستی کی تصویر۔ بظاہر مزاج میں بڑی سختی اور درشتی۔ کبھی غصہ ہوتا، تو بڑے بڑے تندرست جوانوں کو ایک طمانچے میں قلابازیاں کھلادیتے۔ مجھے ایک بار ایک طمانچہ رسید کیا تو میں سائبان سے نیچے گر کر بیہوش ہوگیا۔ لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی۔ کم سخن کم آمیز۔ اپنے بچّوں سے بھی بالکل لئے دیئے رہتے۔ کبھی بے تکلّف نہ ہوتے۔ بیٹوں کو بیٹا کہہ کر شاید ہی پکارا ہو، میاں کہتے یا بابو۔ بیٹیوں کو بی بی کہتے۔ محمودہ بی بی، سعیدہ بی بی، رشیدہ بی بی۔ بڑی بہن محمودہ کو دو بچّے ہوئے لیکن کبھی گود میں لیکر پیار کرتے نہ دیکھا۔ بہت پیار آیا تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی نازک چھڑی سے ذرا مسکرا کر چھو دیا۔ مگر قلب کے اتنے کمزور کہ ذرا گھر میں کوئی بیمار ہوا اور دن رات سرہانے کرسی پر بیٹھے رہتے، نہ کھاتے نہ پیتے، خاموشی سے کچھ پڑھتے رہتے اور پھونکتے رہتے۔ میرے بڑے بھائی سلیم احمد مرحوم کو دق کی بیماری ہوئی، کئی سال بیمار رہے، بیٹے کے آخر وقت میں بیٹے اور باپ یعنی مریض اور تیماردار کے قویٰ میں بہت کم فرق رہ گیا۔ وہ بھی گل گئے یہ بھی گھل گئے۔ دل چھلنی مگر جبیں پر شکن نہیں۔ بھائی کی آخری ساعتوں میں دیکھا کہ سرہانے بیٹھے اپنی انگلیوں سے بیٹے کے سر میں کنگھا کر رہے ہیں۔ بیٹے پر تقریباً نزع کا عالم ہے، بیٹے نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کہا "ابّا بہت نیند آرہی ہے سو جاؤں"؟ باپ نے کہا "سو رہو نے بیٹا کیوں تکلیف اٹھاتے ہو"۔ بیٹے نے آنکھیں بند کرلیں اور ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ حقّہ پیتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے، ہم سب کو الگ کمرے میں

کر دیا، لوگ آئے تجہیز و تکفین ہوئی۔ تہینوں تک صرف حُقّہ رہا اور وہ رہے، بہت اصرار پر کبھی دو چار لقمے حلق میں اُتار لیا۔ گرچہ اس کے بعد کئی سال زندہ رہے، مگر کلیجہ چھلنی ہوگیا، جگر میں زخم ہوگیا، انتقال کر گئے۔

اِن شخصیتوں کی چھاؤں میں۔ ان محبت کرنے والوں اور محبت پر جان چھڑکنے والوں کے سائے میں میرے شعور نے آنکھیں کھولیں اور انہی سے میں نے بھی محبت کرنا اور محبت پر جان چھڑکنا سیکھا اور ایسا سبق سیکھا کہ کبھی نہ بھولا۔ محبت کے اتھاہ سمندر میں یہ شخصیتیں، اِن شخصیتوں کا ماحول اور ماحول کے تمام اجزا چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں جو اس سمندر کے موجوں پر ہچکولے کھاتی رہتیں۔ یہ سمندر اور یہ کشتیاں اب بھی باقی ہیں اور اس سمندر میں اب بھی ہچکولے اُٹھتے رہتے ہیں۔ انہی موجوں سے ان کشتیوں کے ٹکرانے کی ہلکی ہلکی صدائے بازگشت میری زندگی کے تجربوں سے گھل مل کر تلخ و شیریں گیتوں کی تخلیق کرتی ہے۔

جب میں اسکول سے چھٹیوں میں گھر آتا تو فتوحہ اسٹیشن کو جہاں سے میرے گھر کے اسٹیشن کو جانے والی مارٹن کمپنی کی چھوٹی لائن شروع ہوتی اپنی جنّتِ ارضی کا دروازہ سمجھتا تھا۔ یہیں سے نئی کیفیات، نئی اُمنگوں اور نئی خوشیوں کی آہٹیں دل میں گونجنی شروع ہوجاتیں۔ فتوحہ اسٹیشن پر موسٰی میاں کی چھوٹی سی چائے کی دوکان میں چھوٹے سے ٹیبل کے گرد چند چھوٹی چھوٹی کرسیاں لگی رہتیں۔ ہم لوگ چھوٹی لائن کا سفر شروع کرنے سے پہلے موسٰی میاں کے یہاں

دو ایک خستہ قلچے اور چائے پی کر اُس لذّتِ زندگی کا آغاز کرتے جو اُس جنّتِ ارضی میں ڈھیر کے ڈھیر پڑی تھی اور جو ہمیں سیروں بلکہ منوں کے وزن سے تُل کر ملنے والی ہوتی ۔ موسیٰ میاں کی شُستہ اور شایستہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی علاقے میں ضربُ المثل تھی ۔ جو اُن کے خستہ قلچوں اور شیریں اور لذیذ چائے سے مِل کر نئی چاشنی پیدا کر دیتی ۔ ایک بار ہمارے ساتھ سفر کرنے والوں میں ہمارے جوار کے ایک نئے داماد تھے ۔ نئی صورت دیکھ کر موسیٰ میاں نے پوچھا " عزیزم آپ کا دولت خانہ کہاں ہے ؟ وہ بھی منچلے اور چُست گفتگو کرنے والے تھے ۔ اپنے خیال میں دولت خانہ کی رعایت سے معنویت پیدا کرنے کی کوشش میں جواب دیا :-

" غریب کا دولت خانہ بہار بنک ہے " ۔

موسیٰ میاں نے برجستہ کہا " اچھا وہ جہاں منی رکھی جاتی ہے " ۔

ایک فرمائشی قہقہہ پڑا ۔ میں اُس وقت تو نہ سمجھ سکا ۔ اِس فقرے اور لفظ " منی " کی دُہری معنویت کا اندازہ بعد میں ہوا ۔ اس کے بعد جب دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیتیں سامنے آئیں ، رعایتِ لفظی اور ایہام کی صنعتوں سے باخبری ہوئی تو حیرت ہوئی ۔ گلزارِ نسیم میں جو الفاظ اتنے اہتمام سے آئے ہیں ان دیہاتی خوش گویوں کے سامنے کتنا پیش پا افتادہ تھے ۔

جب اپنے گاؤں کے اسٹیشن سے کھٹولی پر گھر کی طرف روانہ ہوتا تو ہر قدم پر دِل کو نئی اُمنگوں کی چاپ محسوس ہوتی ، کان ہواؤں میں نئے گیتوں کے زیر و بم سنتے اور آنکھیں تاڑ ،

برگد، پیپل، کھجور، آم اور مہوؤں کے گذرتے ہوئے سایوں میں نئی راحتوں کے خواب دیکھتے ــــ دروازے پر میری ماں اور چھوٹی بہنیں کھڑی رہتیں۔ ماں بلائیں لیتی اور چھوٹی بہنیں ننھے ننھے آنچلوں میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ چھپاکر مُسکراتی ہوئی جُھک جُھک کر سلام کرتیں اور میں سب سے لپٹ جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہی تو جنت ہے۔ آنگن میں اُچھلتا اور کُودتا اور چھوٹی بہنوں کے ساتھ ستون کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلتا۔ گھنٹے دو گھنٹے یوں گذر جاتے تو کچھ کھانے پینے کی طرف زبردستی متوجہ کیا جاتا۔ کھا پی کر فوراً گھر سے باہر نکلتا، بغل کے مکان میں عبدالعزیز چچا اور کبیر چچا کی بیٹیاں حاجرہ بہن، زینت بہن، عزیزہ بہن اور نفیسہ بہن ملتیں۔ اِن کی دُعاؤں اور مُسکراہٹوں میں غوطہ لگاکر آگے بڑھتا تو رقّو (رقیہ) نانی کا مکان ملتا...... "ارے کلیم! تیں تو بڑا لمبا ہوگیا ہے"۔ "آداب رقّو نانی! اور کہاں ہیں زبیدہ خالہ اور رقیّہ خالہ"؟ اور دونوں آنچل سمیٹتی ہوئی مُسکراتی ہوئی سامنے بیٹھ جاتیں، دو چار منٹ سلام کرکے آگے بڑھتا تو خدّو خالہ (خدیجہ) اور ظفیر خالو! "سلام خالہ"۔ "خوش رہو بیٹا کیسے ہو بیٹا"؟..... "ارے خدّو خالہ یہ سوکھا سوکھی خیریت خیر صلا، یہ جھوٹ موٹ بیٹا بیٹا، پہلے امرود کھلاؤ تازہ امرود توڑ و"۔ "ارے کھا، کتنا امرود کھائے گا، وہ دیکھ شہدی امرود اور یہ دیکھ سعیدی امرود ہے"۔ وہاں سے آگے بڑھتا تو ایک بہت بڑا گھر دو منزلہ، اُسی میں واعظ نانا، اظہر نانا، اعظم نانا، ذکی نانا، شفیع نانا اور اُن کی بیویاں۔ بڑی نانی، منجھلی نانی، سنجھلی نانی اور قیسمن نانی اور چندا نانی اور اُن کی

بیٹیاں حُسنہ خالہ اور درگاہن خالہ اور ہالو خالہ اور بالو خالہ "سلام نانی..... سلام خالہ" ...."ارے کلوا آیا (کلیم کا گھریلو نام کلوا پڑ گیا تھا) کلوا آیا"۔ سلام دُعا چیخ پکار ہنسی کھیل اُچھل کُود........"ارے کلوا تیں تو لمبا ہو گیا ہے اور دُبلا ہو گیا ہے........ ارے کلوا سُنا ہے کہ تیں بائیسکوپ دیکھے ہے اور تھیٹر دیکھے ہے؟"......... "اجی نانی تم ہم کو کلوا کاہے کہتی ہو؟ دیکھو حُسنا خالہ ہم تو گورے چٹے ہیں ہم کو کلوا کاہے کہتی ہو حُسنا خالہ؟"........ "ارے کلوا ہم تو سُرو (شروع) سے تیھکو کلوا کہتے آئے ہیں اچھا تیں گورا کلوا سہی ہم تو کلوا ہی کہیں گے، ہم کو کلیم نا کہے آوے ہے"........ "اچھا نانی گورا کلوا سہی........ اور دیکھو درگاہن خالہ تمہارے دانت کتنے بڑے ہیں اور باہر نکلے ہوئے ہیں...... تم تو ہم کو کلوا مت کہو" ...."اچھا نگوڑے کوڑھے میرا دانت نکلا ہوا ہے؟........ بڑا بڑا دانت ہے؟...... اچھا تو تیں کلوا ہے کالا کلوا ہے کلوا کلوا کلوا ...." میں نے دانت نکال کر مُنہ چڑھایا اور بھاگ کر مردانے حصّے کی طرف نکل گیا۔ قیمن نانی کے بڑے صاحبزادے سید شاہ بدرالدین عرف شاہ دمو، جنھیں ہم کبھی صرف شاہ صاحب کہتے کبھی دمڑ شاہ۔ مجھ سے سِن میں کافی بڑے مگر بچپن سے دانت کاٹی دوستی، لنگوٹیا یاری.............. "ارے کلیم تم آ گئے؟"......... اِدھر سے میں دوڑا اُدھر سے شاہ صاحب........ "ارے شاہ صاحب........ دمو ماموں........ دمڑ شاہ...... .... دمڑی کی بُلبل ٹکڑا اُچھالی........" میں اُنہیں چڑھاتا ہوا گلے سے لپٹ جاتا.....

.... "نالائق...... گدھا..... بیہودہ........ تو بیہودگی سے باز نہیں آتا........."

شاہ صاحب بے تحاشہ ہنستے ہوئے دیر تک لپٹے رہتے .... شاہ صاحب کے بال سیاہ اور ایسے گھونگھریالے کہ اُن میں کنگھا کرنا دشوار ہوتا تھا۔ آنگن میں سنگرہار کے پھولوں کا درخت تھا، ہر وقت پھول ٹپکتے رہتے تھے، میں پھول چُننے لگا....... "شاہ صاحب! آپ تو سنگرہار کے پھولوں کے سائے میں رہتے ہیں......... پھولوں سے کھیلتے ہیں، پھولوں میں رہتے ہیں، پھول بنے ہوئے ہیں......... آئیے میں آپ کو واقعی پھول بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں"........ میں نے دوڑ کر مٹھی بھر سنگرہار کے پھول شاہ صاحب کے گھونگھریالے بالوں میں ڈال دیئے.......... ننھے ننھے سنگرہار کے پھول واقعی شاہ صاحب کے پیچیدہ و خمیدہ بالوں میں داخل ہو کر پھولوں کا گلدستہ بن گئے.......... اب شاہ صاحب خفا ہو رہے ہیں اور بالوں کو جھاڑ رہے ہیں لیکن ننھے ننھے پھول بالوں سے نکلنے کے برخلاف اور حلقوں میں سمائے جاتے ہیں........ "اُف کل اِن کمبخت بالوں کو ضرور ترشوا دُونگا"........ بال تو کبھی نہیں ترشے، مگر کچھ دنوں بعد گردن ترش گئی۔

وہاں سے نکلا تو قاضی نذیر حسین صاحب عُرف ننھّو نانا چھ فیٹ لمبے آدمی گورے چٹے دُبلے پتلے سفید ململ کا کُرتہ سفید پاجامہ سُنہری لیس کی اُونچی ٹوپی سلیم شاہی جوتا، سفید داڑھی سفید زلف، دونوں ہاتھ کمر کے نیچے ڈالے تسبیح پڑھتے ہوئے چہل قدمی کر رہے ہیں...... "سلام علیکم ننھّو نانا"......... "اہاہ آ گئے ناتی!"......... "ہاں ننھّو نانا آج تو آپ بڑے اچھے لگ

رہے ہیں"........ "دیکھو کلیم! آج شام کو ہم تم سے بیٹھ کر ایک نعت سُنیں گے، ایک غزل سُنیں گے اور ایک گیت سُنیں گے........ دیکھو تمہارے نصیر ماموں، بشیر ماموں اُدھر بیٹھے ہیں، تمہیں دیکھتے ہی باغ باغ ہو جائیں گے"........ میں نے پھاٹک کے اندر قدم رکھا تو گول بدن ناٹے قد سُرخ و سفید رنگ کے قاضی نصیر حسین ماموں اوٹنگ خالتہ پاجامہ ململ کا کُرتہ ترکی ٹوپی پہنے پان کھا رہے ہیں........ مجھے دیکھتے ہی ایسا ہنسے کہ پان کی گلوری مُنہ سے نکل پڑی اور سُرخ پیک کے کچھ قطرے سفید کُرتے پر بکھر گئے........ "ارے میاں تم تو غضب کرتے ہو کلیم، اتنے اتنے دنوں پر آتے ہو۔ ابھی تو اسکول میں پڑھتے ہو، کالج میں جاؤ گے تو پھر پوچھو گے بھی نہیں"........ "نصیر ماموں آپ کیا کہتے ہیں، میرا شہر میں جی لگے ہے؟ وہ تو قید خانہ ہے، قید کی زندگی گذارتے ہیں........ نصیر ماموں! ہم شہر میں رہتے ہیں لیکن دل اور دھیان آپ ہی لوگ کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور نصیر ماموں! جتنے دن کیلئے ہم آئے ہیں وہ تو چٹکیوں میں گذر جائیں گے۔ اُس دن کا خیال آوے ہے جس دن شہر کو واپسی ہو گی، تو اسی وقت سے دل دھڑکے ہے........ جب اِس پاکڑ کے درخت کو، اِس توریٔ اور سیم کی لَت چڑھی ہوئی دیواروں کو، آلو کے اِن کھیتوں کو اور لاٹھا کے ڈول چلاتے ہوئے بخشو میاں اور جمعراتی میاں کو، آپکے سائبان کو، اِن چوکیوں پر دُور تک سفید چاندنی کے فرش کو اِن گاؤ تکیوں کو دیکھتے ہوئے گذرینگے اور روئینگے"........ "ہاں کلیم، جب تم

تیلہاڑہ سے جاتے ہو تو تمہاری حالت دیکھ کر ہم سب بیقرار ہوتے ہیں۔ خیر تم آج ہی آئے ہو چھوڑو اِن باتوں کو، تم جب آتے ہو تو ہم لوگوں میں نئی زندگی آجاتی ہے .... آج ہم بھی تمہیں غزل اور گیت سُنائیں گے اور تم سے بھی سُنیں گے" .... "ہاں نصیر ماموں آج ہم کو غالب کی غزل سُنائیں گے" .... بھائی ظفر امام صاحب ہماری بستی کے سب سے حسین اور جامہ زیب جوان، نکلتا ہوا قد، چھریرا بدن، چوڑی چھاتی، بھرے بھرے بازو، لمبی گول گردن، چوڑی پیشانی، خوبصورت آنکھیں .... جو لباس پہن لیں کھل جائیں .... لنگی بنیائن میں بھی، قمیص پاجامے میں بھی، کُرتہ اور چُست تہری دار پاجامے بھی، ننگے سر بھی، کامدار دوپلی ٹوپی کے ساتھ شیروانی میں بھی، کوٹ قمیص میں بھی، جس حال جس لباس میں دیکھئے سینکڑوں میں ایک معلوم ہوں .... اور چہرہ کا یہ عالم کہ ہر وقت شگفتہ ہو رہے ہیں، باچھیں کھلی ہوئی ہیں، ایک کبھی نہ ختم ہونے والا تبسم جس کی سرحدیں کھل کھلاہٹ کی سرحدوں سے ملی ہوئی رہتی تھیں، مجھے دیکھتے ہی کھل اُٹھتے .... "ارے میاں کلیم! .... دیکھو آج ہی نیا کُرتہ پہنا ہے، تم تو مارے حسد کے جل گئے ہوگے"؟ یہ اُن کا گویا تکیۂ کلام تھا لیکن صرف میرے ساتھ۔ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے اور میں بھی گویا جان چھڑکتا تھا، اس لئے وہ یہ جملہ اکثر استعمال کرتے .... "دیکھو یہ ٹوپی آج گیا سے سلوا کر اور دُھلوا کر منگوائی ہے۔ تم تو دیکھتے ہی جل گئے ہوگے"! .... "ارے بھیا ہم تو بس جل کر خاک ہی ہو گئے" ....

.... "اچھا کلیم! بیٹھو سنو، غالب کی ایک غزل سنو ...." وہ شعر و سخن کے دلدادہ اور غالب کی غزلوں کے رسیا تھے۔ غالب کی شاعری سے آشنائی اور اس کی غزلوں سے پہلی جان پہچان مجھے ظفر امام بھائی ہی کی صحبتوں میں ہوئی۔ اور اُسی دور میں مجھے غالب کی اکثر غزلیں یاد ہوئیں۔ وہ گویا دیوانِ غالب کے حافظ تھے اور چست و چپاں برمحل اور باموقع اشعار پڑھنے میں چونکا دینے کی حد تک مہارت رکھتے تھے .... ان کے بالکل بغل ہی میں ان کے پھوپھی زاد بھائی سید شاہ عبدالحفیظ صاحب کی مردانہ نشست گاہ تھی۔ حفیظ بھائی میانہ قد، چوڑا چکلا سینہ، پتلی کمر، کچی پکی گول ترشی ہوئی داڑھی ہارمونیم سامنے رکھے بیٹھے ہوئے ہیں....

.... "اخاہ کلیم سلمہٗ، تم آگئے؟ کب آئے؟ آج ہی آئے کچھ کھاؤ گے ....؟ اچھا حلوہ منگاؤں....... جاؤ بیٹی شکیلہ امّی سے کہنا تشتری میں حلوہ دیجئے" ....

شکیلہ اور نور جہاں دو نازک شرمیلی ننھی بچیاں یک زانو بیٹھی قرآن شریف کی سطروں پر شہادت کی اُنگلی رکھے جھوم جھوم کر سبق یاد کر رہی ہیں۔ "اچھا بیٹی نور جہاں تم بھی جاؤ .... سنخیا! ارے سنخیا!!" .... "جی آیا" .... "بیٹھ سنخیا"...... حفیظ بھائی نے ہارمونیم کھینچی، پتلی لمبی انگلیاں ہارمونیم کی پٹریوں پر دوڑنے لگیں .... ہاں سنخیا شروع کر .... مُرغِ دل ...."

سنخیا دونوں ٹخنوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیکر اکڑوں بیٹھ گیا۔ گردن دائیں مونڈھے

کی طرف ذرا جُھکا کر درد ناک آواز میں غزل شروع کی :

مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع

ہم قفس کے قیدیوں کو آب و دانہ ہے منع

سماں بندھ گیا۔ اچھی آواز سخیا بھی گاتے گاتے جھومنے لگا۔ حفیظ بھائی کا چہرہ بھی تمتا رہا ہے۔ سخیا نے ظفر کی غزل ختم کی اور حفیظ بھائی نے غزل شروع کی۔ میں اِس غزل کو انہی کی غزل سمجھتا رہا، اب تک تحقیق نہیں ہو سکی ہے کہ کس کی ہے :

آرزو ہے وفا کرے کوئی　　ہم کو چاہے خدا کرے کوئی

عشق میں ہے ضرور رُسوائی　　دِل نہ مانے تو کیا کرے کوئی

ہم تو بیٹھے سُنا ہی کرتے ہیں　　لاکھ گالی دیا کرے کوئی

غزل چل رہی ہے کہ معین الدین حیدر صاحب تشریف لائے .... نواب صاحب ٹونک کے مصاحب سال میں ایک بار ٹونک سے گھر آتے .... دُور ہی سے داد دیتے ہوئے آرہے ہیں ....

" سُبحان اللہ شاہ صاحب .... غزل گانا اور چیز ہے، آپ تو مجسّم غزل بن جاتے ہیں .... میں ٹونک میں رہتا ہوں، نواب کا دربار .... امارت نفاست نزاکت ساون کی جھڑی کی طرح برستی ہے، لیکن سال میں ایک ماہ جو لُطف جو کیفیت جو حسن طبیعت اور سادگی یہاں نصیب ہوتی ہے، وہ ٹونک کے گیارہ مہینوں میں کہاں ؟" ....

معین الدین حیدر صاحب تیلہاڑہ کی خاک سے اُگنے اور نشو و نما پانے والے ٹونک کی درباری فضا میں جوانی سے آغازِ پیری تک وقت گذارنے والے ادب، شاعری اور زبان و بیان کے حسین اور رنگین ماحول میں پھولنے پھلنے والے جب گفتگو کرتے تو تیلہاڑہ کی سادہ دیہاتی فضا میں رنگ، نور و نکہت کی بارش برسانے لگتے۔ میں اُن کی گفت گو سُنتا تو سُنتا رہ جاتا۔

بھائی عبدالحفیظ صاحب کی ذات ایک انجمن تھی اور ان کی نشست گاہ ایک سماجی ادارہ۔ وہ موسیقی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، شعر و ادب کا بڑا سُتھرا مذاق، مجلسی گفتگو کا بڑا اچھا ڈھنگ اور سماجی مسائل پر مباحثہ اور اس کے حل نکالنے میں طاق۔ مقامی سیاسیات کے بھی ماہر۔ خوش وضعی اور خوش مذاقی تو خانہ زاد تھی۔ ہر دو چار روز پر کسی شاعر کا دیوان ذاتی کتب خانہ سے نکلوایا جاتا۔ معین الدین حیدر صاحب، ماسٹر یعقوب صاحب، مولانا عبدالصمد طپش، شاہ عبدالحمید حمید اور بھائی ظفر امام صاحب کے درمیان ایک ایک شعر پڑھا جاتا اور اس کے معنی و مفہوم اور اسلوب پر خیال آرائی ہوتی۔ کبھی کبھی ساز و نغمہ کا دَور چل جاتا۔

ذرا اور آگے بڑھئے تو شاہ قمر العرب صاحب، فخر العرب صاحب، نجم العرب صاحب۔ عرب برادران۔ دل کے غنی، زبان کے شیریں، مزاج کے کشادہ، وضع کے سادہ، مُسکرا کر باتیں کرنے والے، بہت جلد روٹھ جانے والے اور روٹھ کر بہت جلد من جانے والے۔ اور وہ بھائی شاہ عبدالحسیب صاحب پتلے دُبلے منحنی۔ کبھی اتنے سنجیدہ کہ ہنستا ہوا آدمی انہیں دیکھ کر اپنی ہنسی

بھول جائے اور کبھی اتنے شگفتہ رُو، کہ رونے والا ہنس دے .... خالتہ پاجامہ، بادامی شیروانی، ترکی ٹوپی اور سیاہ بوٹ، بائیں ہاتھ میں شیروانی کے دامن کا کونا پکڑے ہوئے تیلہاڑہ کی گلیوں میں نکلتے تو بے ساختہ میری زبان سے نکل جاتا کہ "حبیب بھائی یہ پٹنیا ٹھسّہ ہے"۔ تو وہ بول اُٹھتے کہ "میاں کلیم .... ؏ کل تم پھروگے چاک گریباں کئے ہوئے"......

سر سُلطان کے بیٹے نجم الحسن صاحب کی شادی کا شاید آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے، جس میں اُس زمانے میں تین لاکھ رُوپیہ صرف ہوا تھا اور پٹنہ کی آخری شاہانہ شادی تھی۔ مُلک کے اکثر رؤسا راجگان اور نوابان اور اُن کی منظور نظر گانے والیوں کا ہجوم ہوا تھا۔ حبیب بھائی اُس تقریب کی دو نقلیں کرتے۔ ایک تو گوہر جان طوائف کے طبلئے کا کیر یکچر جسے ہم لوگوں نے پچیسوں بار دوپہر یا رات کے سنّاٹے میں کسی بند کمرے میں اُن سے سُنا اور ہر بار نیا لُطف آیا اور پھر گھنٹوں ہم لوگوں کو ہنسی ضبط کرنا دُشوار ہوتی۔ ہنستے ہنستے ہم لوگ ڈھیر ہو جاتے اور وہ کیر یکچر کر کے خاموش بیٹھے رہتے۔ دوسری چیز مہاراجہ جے پور کی منظور نظر چھوٹی زہرا کے مُجرے کی تصویر جس میں اُس نے فارسی کی یہ غزل گا کر محفل کی محفل کو تصویرِ حیرت بنا کر چھوڑ دیا تھا:

ہر غنچہ بشگفت اِلّا دلِ من
اے وا دلِ من صد وا دلِ من

بھائی حبیب صاحب اس سنجیدگی سے اُس کی غزل سرائی کی تصویر کھینچتے کہ واقعی ہم لوگوں پر بھی

کیفیت طاری ہو جاتی ۔ اور یہ سب اُسی بادامی شیروانی اور سیاہ ٹوپی میں ہوتا۔ حبیب بھائی کی شیروانی کے ساتھ اپنے گاؤں کی صبح عید اور عید گاہ کا منظر سامنے آجاتا ہے .... میرے گھر کے بالکل سامنے عیدگاہ کے دروازے پر صبح عید کو طلوع آفتاب سے پہلے ظہیر الدین عرف تحدّو حلال خور متقی پاکباز نمازی لنگ باندھے لمبا کرتہ سفید دوپلی ٹوپی لمبی داڑھی اپنے بھائی کے ساتھ نقارہ بجانا شروع کرتا۔ پہلے بچوں کا ہجوم ہوتا اور پھر شیروانیوں کی آمد شروع ہوتی ۔ اور پھر جوق جوق مختلف لباسوں میں دوگانۂ عید ادا کرنے کو آنے والے خواجہ تعشق لکھنوی کے اِس شعر کا منظر بن جاتے کہ :

ہر طرف حشر میں جھنکار ہے زنجیروں کی
اُن کی زلفوں کے گرفتار چلے آتے ہیں

سفید شیروانی ، سیاہ شیروانی ، سُرمئی شیروانی ، زرد ، نیلی ، بادامی شیروانیاں ، پاکھڑ کے سائے میں عیدگاہ کے دروازے پر رنگ برنگ کی تتلیوں کا منظر بن جاتیں اور تھوڑی دیر کیلئے ایسا معلوم ہوتا کہ تیلہاڑہ کی دیہاتی فضا میں عظیم آباد قدیم کی گمشدہ روایت زندہ ہو گئی ہے ..

.... اور عید کی اِن چند گھڑیوں کی تصویر کے ساتھ محرم کے عشرۂ اوّل کے آخر تین دنوں کا منظر بھی جوڑ دیا جائے ، تو عظیم آباد کے محلہ کیوان شکوہ اور تیلہاڑہ میں کوئی فرق شاید نہ رہ جائے .... یہ ہے نویں محرم کی دوپہر ، یہ بیٹھیا کا میدان ۔ اور

سب سے آگے دیکھئے یہ ہے محلہ کمرہ کی سپر اور تعزیہ - اور یہ ہیں اکھاڑے دار شاہ رضا خاں صاحب
۲/۱-۶ فیٹ کا قد آور سُورما، ترکی ٹوپی، خالتہ پاجامہ، بادامی قمیص، سرخ و سفید چہرہ، ہاتھ میں
تلوار اور کمر میں پٹکا - اور یہ ہیں رشید الدین خاں عُرف نتھوں خاں، میانہ قد بالشت بھر سینہ
اُبھرا ہوا، پہلوان صورت، رئیس طبیعت - اور یہ ہیں سیّد عبد الغنی اور محمد ظہور صاحبان،
جسم اور چہرے سے بوڑھاپے کا شباب ٹپک رہا، لیکن طبیعت کے پردے سے لڑکپن کی جوانی
جھانک رہی ہے - لڑکے جوان بوڑھے، سب ایک آواز ایک آہنگ - یونہی رات کٹ جائے گی
ہم صفیرو بُ میں آواز دُونگا تم آواز دینا - سب ایک آہنگ ہو کر نعرہ لگا رہے ہیں ......
یا حسین ...... یا حسین ...... بولو بولو یارو ...... بولو بولو کمرہ کے جوانو ...
...... یا حسین ...... یا حسین حسین حسین حسین .... -
اور یہ ہے ہمارے محلہ عیدگاہ کی سپر .... اور یہ امام حسین کا ڈنکا کون بجا رہا ہے؟
ارے یہ تو ہمارے اعظم نانا ہیں ڈاکٹر سیّد محمد اعظم ...... سانولہ چہرہ، چھریرا بدن، بدن کے
روئیں روئیں سے حوصلہ مندی اور بلند عزمی نمایاں ...... گلے میں بڑا سا ڈنکا لٹکائے چوب
ہاتھ میں لئے جوش کے ساتھ امام حسین کا ڈنکا بجا رہے ہیں ...... بجے ڈنکا اماموں کا .....
بجے ڈنکا اماموں کا ...... آواز ڈنکے سے نکل رہی ہے .... - اور یہ سپر
کون گھما رہا ہے؟ ...... ارے یہ تو ہمارے اطہر نانا ہیں سید شاہ اطہر حسین امام جامع مسجد

اور یہ سپر کی ڈور لئے کون ہیں ؟ .... یہ تو ہمارے واعظ نانا ہیں سید واعظ الحق ....
اور یہ ہیں ہمارے شاہ صاحب ..... شاہ دم صاحب ۔ سیاہ گھونگھریالی زلف پر بادامی کشتی نما
ٹوپی رکھے سفید کنواس کا باٹا کا ٹینس شو پان کھائے کمر سے پٹکا باندھے بجلی کی طرح کوندرہے ہیں۔
اور یہ ہیں سید نظام الدین ان کے چھوٹے بھائی ، گورے چٹے ہنس مکھ سیاہ چھوٹی چھوٹی داڑھی
ہر وقت باچھیں کھلی ہوئی .... ۔ اور یہ غلام حیدر شبیر، میانہ قد، چکیٹھا بدن ، گٹھے
ہوئے شانے اور بازو .... زرد سلک کی قمیص اور سفید شلوار جس سے نیلا ازار بند جھول
رہا ہے .... " ایں خانہ ہمہ آفتاب است " ایک پر ایک وضع دار اور جامہ زیب ، سپر شمع
ہے اور یہ سب پروانے ہیں .... سپر بھی شاندار ، سپر پھیرتے اور گھمانے والے بھی
شاندار .... تہذیب کے نمونہ ، حسن وضع کے مرقع ، شرافت کی تصویر ، شائستگی اور وضع
داری کے علم بردار ، کبھی سپر گھما رہے ہیں کبھی ڈنکا بجارہے ہیں ۔ اور یہ ہیں سید نجم الہدیٰ عُرف
نجّہ بھائی حاضر جواب بذلہ سنج ۔ اور یہ قاضی عین الحق اور یہ قاضی ریاض الحق اور قاضی سراج الحق۔
اور یہ ہیں ہم سب کے محلّے کے چودھری جناب قاضی سیّد ظہور الحق ناٹے قد کے آدمی بڑے ظریف
طبیعت اور کھرا مزاج ۔ اور یہ ہیں ہمارے مولوی سید عابد حسین صاحب .... موٹے لٹھے کا لمبا
کرتہ ، عنابی رنگی ہوئی مارکین کی لنگی ، بڑی گھنی زلف پر سفید دوپلی ٹوپی ، ہاتھ میں موٹا اور
لمبا عصا، غور سے سب کو دیکھ رہے ہیں ...... غلام حیدر شبیر سپر گھما رہے ہیں ....

ذرا سا چال میں سُستی نظر آتی ہے، مولوی عابد حسین صاحب وہیں گرجتے ہیں۔ "کیا بے حیدر روا .... خالی دیکھنے ہی کو پہلوان بنا ہے۔ اتنا دھیرے دھیرے سپر گھما رہا ہے۔ تین ہی من کے بوجھ میں دُم پھول رہا ہے .... اِس بُڑھاپے میں بھی پانچ من کی سپر پھول کی طرح گھما کر رکھ دیں .... (اور قاضی ظہور الحق صاحب کو مخاطب کرکے) کیا بے ظہور روا کا جی پھچاک، کا جی بنا پھرتا ہے (غالباً قاضی صاحب سے سالے بہنوئی کا رشتہ ہوتا تھا) تو بھی کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہے .... حرام زادے سال بھر بیٹھ کر کھاتے ہو، تین دن پسینہ بہانے سے گھبراتے ہو"؟ .... اور قاضی ظہور صاحب بھی بوڑھاپے میں جوانی کی چمک پیدا کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے چھمک کر آگے بڑھے .... "ابے سالے مولبی (مولوی)! تو بڑا سور ما ہے تو بدن کیوں نہیں ہلاتا ہے، خالی زبان ہلاتا ہے؟" .... "تو مجھے کیا سمجھا ہے رے کا جی پھچاک .... لے رے صفوا (قاضی عین الحق، قاضی ظہور کے بڑے لڑکے) میرا ڈنڈا تو تھام" ...... اور مولوی صاحب کمر بند کس کر واقعی سپر کو پھول کی طرح گھمانے لگے۔

خوش رو خوش چہرہ بچے بھی۔ خوش پوش خوش لباس جوان بھی۔ خوش وضع خوش مزاج بوڑھے بھی۔ ایک آواز .... حسن حسین۔ حسن حسین۔ حسن حسین ...... بولو بولو یارو .... بولو بولو عیدگاہ کے جوانو .... حسن حسین۔ یا حسین۔ یا حسین ....

تین دنوں تک محلّے محلّے دھوم .... سبز پوش بچے" گردن میں تارہ اور بادلے کی بدھیاں گلے میں ڈالے جن میں سنہری اور روپہلی کلابتوں سے بنے ہوئے حسین نازک بٹوے جھول رہے ہیں .... ان بٹوؤں میں بُن دھنیا (دھنیا - گری - چھوہارہ اور دوسرے میوہ جات اور مغزیات کا مرکّب) بھرا ہوا - اکھاڑے اکھاڑے کھچڑی اور پلاؤ پک رہے ہیں - توشے کی روٹیاں بن رہی ہیں اور تقسیم ہو رہی ہیں - دُودھ اور شکر کے شربتوں کی سبیل مٹی کے کوزوں میں چل رہی ہے - مرثیے پڑھے جا رہے ہیں .... اکھاڑے جمے ہوئے ہیں - کھلاڑیوں کی بھیڑ ہے ..... بانے کے ہاتھ پھیرے جا رہے ہیں .... پٹے گھمائے جا رہے ہیں ...... گدکوں کی پھٹا پھٹ ہو رہی ہے ...... نیزہ بازی کے جوہر دکھائے جا رہے ...... کبھی رستم خانی ٹھاٹ چل رہی ہے۔ کبھی علی مردانی پینترہ دکھایا جا رہا ہے - اُستادوں میں ڈاکٹر محمد اعظم، قاضی سراج الحق، سیّد نجم الہدٰے اور اللہ رکھو میاں تلوار اور ڈھال کے ہاتھ شپاشپ چلا رہے ہیں - اور کبھی اِن سب کے اُستاد گھسو خلیفہ علاقے کے مانے ہوئے تلوریئے اور بنوٹیئے اِن چاروں سے بیک وقت چومکھی لڑ رہے ہیں .... گھسو خلیفہ بوڑھے آدمی ستّر بہتّر سال کی عمر، بھاری کسرتی بدن سر مُنڈا ہوا گیروئے رنگ میں رنگا ہوا کُرتہ اور لنگی اور دو پلی ٹوپی گھنی داڑھی، چاروں چھیتے شاگردوں کے درمیان بجلی کی طرح کوند رہے ہیں .... "لے رے اعظم یہ کنپٹی کا ہاتھ سنبھال .... اللہ رکھوا دیکھ یہ ہنگ بھری کا ہاتھ چلا ..... سر جوا دیکھ بھنڈارا سنبھال ....

نجوا دیکھ رے یہ جنیو کا ہاتھ ہے۔ دیکھ اس کمر تراش سے بچ "......... مگر اُستاد کے ہاتھ سے کوئی نہ بچ پاتا، اُن کی تلوار کبھی کنپٹی، کبھی پیشانی، کبھی سینے، کبھی پیٹ، کبھی کمر سے چھو کر بجلی کی طرح اُڑ جاتی اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے .... سب میں تیز قاضی سراج الحق تھے اور انہیں اُستاد مانتے بھی تھے۔ اُن پر اُستاد اور زیادہ وار کرتے، کبھی کبھی تابڑ توڑ تین چار وار اُنہی پر کر جاتے۔ اور سراج باوجود تیزی پھرتی اور مہارت کے اُستاد کی ضربوں سے نہ بچ پاتے، تو گھسو خلیفہ غایت جوش اور غصّے کی کیفیت سے مغلوب ہو کر تلوار پھینک کر دوہتڑ سراج کی پیٹھ پر مارتے اور پھر تلوار لے کر اُچک کر دُور جا کھڑے ہوتے۔

اکھاڑے ہوں یا مجلسیں، عیدین کے میلے ہوں یا گھر کی تقریبات۔ جن کو دیکھو قدیم کلاسیکل روایات کی تصویر بنا ہوا ہے۔ شائستگی، متانت، رکھ رکھاؤ کا دامن کسی موقع پر کسی ماحول میں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ایک سطح ہے جو معیاری ہے، وہ سطح ہر حال میں قائم رہتی ہے۔ کوئی پروگرام ہو، کوئی نظام ہو، کہیں بھی کسی پہلو سے بھی عامیانہ پن داخل نہیں ہوتا۔ وہ خاص تہذیبی قدریں جو نسلوں سے زندگی کے ہر گوشے اور زاویے میں گہرا رنگ اختیار کر چکی تھیں وہ کسی حال میں ہلکی نہیں ہوتیں۔ وقار کی ایک سطح ہے جو ایک ساں قائم ہے۔

یہ ہلکی پھلکی بے جوڑ منتشر جو تصویریں دِکھائی گئیں، یہی وہ ماحول تھا، یہی وہ جمی جمائی دُنیا تھی جہاں زندگی کے بیس سال گزارے تھے۔ کلکتہ اور پٹنہ کے دَورانِ قیام میں جسم دوسرے

مشاغل میں رہتا، لیکن دل انہی تصویروں میں کھیلتا اور نگاہیں انہی کو ہر طرف ڈھونڈھتیں۔ اور جب اس ماحول میں واپس آتا اور اِن شخصیتوں کی جھُرمٹ میں دن گذرتے تو اِن میں میری شخصیت، میرے کردار، میرے خیال، تصوّرات اور نظریات کی نشو و نما ہوتی۔ اسی ماحول میں میرا دل بنتا، میری نگاہ بنتی، میری زبان بنتی، میری تمنّاؤں آرزوؤں حسرتوں کو رنگ اور آہنگ اختیار کرنے کا موقع ملتا۔

تیلہاڑہ کا قیام انہی خوش رنگ اور خوش آہنگ فضا میں تیزی سے گذرنے لگتا۔ اور جب گھر سے کلکتہ یا پٹنہ آنے کا وقت قریب ہوتا تو گھر آتے ہوئے خوشی، ترنگ اور گدگداہٹ والی کیفیتوں کی بجائے غم کی اور گداز قلب کی دھیمی دھیمی آنچ شروع ہوجاتی اور میں غروب آفتاب سے پہلے بستی سے متصل ایک مُردہ ندی پر دَورِ مغلیہ کا تعمیر کردہ ایک شکستہ پُل پر بیٹھ جاتا اور دیر تک شام کی خاموش اور سکوت آفریں فضا میں اپنے وجود کو گُم کر دیتا اور کبھی غالبؔ کی غزلیں دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے .... اور .... ابن مریم ہوا کرے کوئی...... گنگنایا کرتا اور آنکھوں سے بے ساختہ قطرے ڈھلکنے لگتے۔ میں لحن اور ترنم کا بچپن سے دلدادہ رہا مگر یہ عجیب کیفیت میری رہی۔ اور کبھی کبھی اَب بھی ہوتی ہے کہ کوئی موسم ہو، کوئی مقام ہو، کوئی موقع اور محل ہو جہاں کوئی چیز ترنم سے شروع کی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ شام جب بھیگ جاتی تو خاموش آہستہ آہستہ پُل سے اُتر کر اپنے مکان سے متصل قاضی نصیر حسین

ماموں کے باہر مردان خانے میں چوکی کے فرش پر لیٹ جاتا اور نصیر ماموں ہلکے ہلکے ترنم کے ساتھ اکثر مستورات کے گیت گنگنانا شروع کر دیتے :

آج شہانی ہے رات ، چندا تم اُگیو ...... آج شہانی ......

سہرے پر اُگیو کنے پر اُگیو ...... آج شہانی ہے ......

اور پھر مجھ سے کہتے ...... "ہاں کلیم ذرا سُناؤ .... چھا رہی کالی گھٹا " ....

اور میں ان کے اصرار پر ذرا اُونچی آواز میں گنگنانے لگتا :

چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے

توری کوئلیا باوری تو کیوں ملہار گائے ہے

تیرے پی پی کرنے سے مجھ کو بھی پی یاد آئے ہے

اور میری آواز سُن کر اندر سے نجّو نانا (قاضی نذیر حسین) اور بشیر ماموں بھی اور رحمو نانا بھی لپکے ہوئے چلے آتے ، جنھوں نے تیلہاڑہ میں پہلی مرتبہ ڈاک خانہ قائم ہونے پر یہ شعر کہا تھا جو تیلہاڑہ میں سب کو یاد ہو گیا تھا :

یکم فروری روز منگل سُدی   کھُلا ڈاک خانہ تیلہاڑہ میں جی

اور مکان سے متصل پن گھٹ پر آلو کے کھیت پٹاتے ہوئے جمعراتی میاں بھی چلے آتے اور قریب ہی سے رام کھلاون پاسی اور بادشاہی میاں سبزی فروش بھی ، اور یہ سب پھاٹک پر ایک پاؤں

زمین پر اور ایک پاؤں دہلیز پر رکھے سُنتے رہتے۔

انہی دُھوپ چھاؤں، سُرور اور خمار، خوشی اور ملال کی فضاؤں میں زندگی گذرتی رہی۔ میں نے میٹریکولیشن بڑی امتیازی شان سے پاس کیا........ جس وقت یہ خبر پٹنہ سے تیلہاڑہ پہونچی، والد صاحب سائبان میں حقہ پی رہے تھے۔ فوراً بلایا اور چلم اتار کر دی کہ تازہ تمباکو رکھ کر ٹکیے رکھو اور چلم پھونکو۔ یہ نہ سمجھو کہ بڑی امتیازی شان سے ڈگری لی ہے تو کچھ بن گئے ہو...... .... نہیں یہ نہ سمجھو، بلکہ یہ سمجھو کہ ابھی تو مجھے چلم بھی تیار کرنی نہیں آتی۔ کچھ ہی دن بعد والد صاحب سدھار گئے، میں پٹنہ کالج میں داخلہ لیکر کلاس بھی نہ کر سکا تھا۔ اور ان کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد ۴۴ء میں مجھ سے چھوٹے بھائی علیم احمد کو دق کا عارضہ ہوا اور ڈھائی سال جان توڑ کر اور جی بیچ کر علاج اور تیمارداری کی گئی، لیکن ۴۶ء کے ستمبر میں اس کا بھی انتقال ہو گیا .... میری حالت بہت بگڑ گئی .... مزاج میں بے حد خشکی اور چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔ میں سب کو ساتھ لیکر ایک کرایے کے چھوٹے سے مکان میں پٹنہ چلا آیا ....

والدہ میری حالت دیکھ کر اپنا غم بھول گئیں۔ وہ سمجھانے بیٹھ جاتیں ......" ارے کلیم ! یہ تم کو کیا ہوا جا رہا ہے؟ بال بڑھے جا رہے ہیں .... کپڑے تیرے میلے رہتے ہیں۔ ہر دم غصّہ، ہر دم چڑچڑ .... بیٹا بھائی کا غم کس کو نہیں ہووے ہے، لیکن ایسا مت بن بیٹھا..... اب تو سارا بوجھ تمہیں کو لینا ہے بیٹا....... معصوم بہن کو دیکھ .... چھوٹے بھائی کو دیکھ۔

ہم کو دیکھ .... تم ہی ایسے رہو گے تو کیسے کیا ہوگا بیٹا ...... ہم تیرے بڑے بھائی کا گھاؤ لیکے بیٹھے ہیں، تیری بڑی بہن کو جیتے جی گاڑ کر بیٹھے ہیں، تیرے باپ کو اللہ میاں کے یہاں بھیج کر بیٹھے ہیں .... علیم بھی گیا۔ کیا تو بھی جانا چاہے ہے؟ .... ہم تو تہکو دیکھ دیکھ کر سُن ہوئے جارہے ہیں .... اب ہمارا سن پٹنہ رہنے کا ہے؟ ماں باپ کی ڈیوڑھی چھوڑ کر یہاں بیٹھے ہیں .... دیکھو بیٹیا بقرعید کے دن قریب آرہے ہیں ہم کو گھر جانا ہے ۔ ہم بقرعید میں کبھی گھر سے باہر نہیں رہے ہیں، سب کی طرف سے قربانی کرنی ہے ....

تم اپنے کو سنبھالو بیٹیا تاکہ ہم کو ڈھارس رہے" .... یہ باتیں اکتوبر ۱۹۴۶ء کے آخر عشرہ میں ہو رہی ہیں۔ عیدالاضحیٰ کی چاند رات کو دو چار دن باقی تھے، وہ چاہ رہی تھیں کہ چاند نظر آنے سے پہلے وہ تیلہاڑہ چلی جائیں تاکہ وہاں پہونچ کر کچھ انتظام کر سکیں ....

میں اُن کے تیلہاڑہ واپس جانے کے ذکر سے بہت گھبرایا۔ وہ بھی چلی جائیں گی۔ میری بہن مُنّی بھی چلی جائے گی تو پٹنہ میں کیسے رہوں گا؟ .... میں نے اِس دُنیا میں ہر چیز سے پیار کیا .... اپنے گھر کے لوگوں سے، اپنے اڑوس پڑوس کے لوگوں سے، اپنی بستی سے، اپنے ماحول سے، اپنے اِرد گِرد کی ہواؤں سے، اپنی روایات سے، تہذیب سے، زندگی کی جانی پہچانی قدروں سے، اپنے گھر کے در و دیوار سے، چھتوں سے، زمین سے، آسمان سے۔ لیکن اِن تمام پیاروں میں ماں مجھے سب سے زیادہ پیاری تھی۔ ماں نے اب سے پہلے بیٹیا کہکر مجھے شاید ہی کبھی

پکارا ہو۔ وہ ہمیشہ کلیم کہا کیں .... نہ سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار کیا، نہ آغوش میں بھینچا، نہ پیشانی چُومی .... پیار کی وہ تمام علامات جو اس رِشتے میں دیکھی جاتی ہیں، ان علامات اور اسلوب اظہار سے میری ماں کے پیار کو دُور کا بھی سروکار نہ تھا۔ بڑی رکھ رکھاؤ کی خاتون، بڑا وقار، بڑی وضعداری، بڑا تحمل، بڑا تقدس، بہت الگ تھلگ، لئے دیئے رہنے کا انداز، لیکن ان تمام صفتوں میں وہ کشش وہ شیرینی وہ نرمی اور گھلاوٹ، وہ دل کو پگھلا دینے والی محبت کی تاثیر، کبھی بابو بھیا نہ کہا ہمیشہ "تو" اور "تیں" کہہ کر بات کرنے کا انداز اور ہم لوگ "امّاں" یا "اجی امّاں" کہا کرتے۔ لیکن ہماری اِس بولی میں اور اُن کی اس پکار میں اور اس پُر وقار رکھ رکھاؤ میں دونوں جانب وہ شیفتگی، فریفتگی اور جاں سپاری تھی، جو دیکھنے میں تو کم آتی ہے سُننے میں آتی ہے۔ میں جب گھر سے پٹنہ یا کلکتہ جاتا تو ماں کے باندھے ہوئے امام ضامن کے پیسوں کو ویسے ہی بندھا ہوا جیب میں رکھے رہتا .... "یہ امّاں کی آنچل کا کپڑا ہے اور انہی کے ہاتھ سے باندھا ہوا ہے" .... میں اُسے دن میں دو ایک بار جیب سے نکالتا، دیکھتا، چُومتا اور پھر رکھ دیتا۔ اُن کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھجوروں، نمک پاروں اور حلوہ کا کچھ حصّہ یونہی رکھے رکھے سڑا دیتا، بعد میں پھینک دیتا اور امام ضامن کے پیسے گھر دوبارہ آنے کے وقت ہی خیرات کرتا۔ .... یہ دیوانگی کی باتیں ہیں، بے عقلی کی باتیں ہیں۔ مگر یہی دیوانگی اور بے عقلی کی باتیں اب مجھے ہُشیار بنا رہی ہیں اور عقل سکھا رہی ہیں .... مجھے ماں سے جو محبت تھی وہ

ایک یادگار محبت ہے۔ آج وہ مجھ سے جدا ہیں، ۲۷ ستائیس سال ان کی جدائی کو ہو گئے، لیکن میں آج بھی انہیں ویسے ہی دیکھ رہا ہوں پہچان رہا ہوں، اُن کی آواز سن رہا ہوں انکی قربت محسوس کر رہا ہوں۔ ان کی صورت اور سیرت کے تمام خدوخال میرے حواس شعور اور تصوّر میں ویسے ہی زندہ اور تروتازہ ہیں جیسے وہ ۲۷ ستائیس سال پہلے تھے۔

۲۶ ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو آخر وہ گھر واپس جانے کو تیار ہو گئیں، یہ ذیقعدہ کی ۲۹ تھی اور دوسرے دن سے بقرعید کی تاریخ شروع ہونے والی تھی اور وہ اس دن یعنی یکم ذی الحجہ کو گھر میں موجود رہنا چاہتی تھیں۔ ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۴۶ء مطابق ۲۹ ر ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ یہ میری زندگی کی ایک تاریخ ہے، اُس تاریخ سے آج تک کتنی تاریخیں آئیں اور گذر گئیں، آفتاب طلوع ہوئے اور غروب ہوئے، صُبحیں آئیں اور شامیں ہوئیں' دن آئے اور گذرے، مہینے آئے اور چلے گئے، سال بدلے موسم بدلے زمانے بدلے اور صدیاں آئیں گی اور گذر جائیں گی، لیکن دل کے کلنڈر پر تاریخ کا یہ صفحہ ستائیس سال سے ویسے ہی لٹک رہا ہے۔ ....

۲۶ ر کی صبح ہوئی اور وہ اور میری پیاری بہن ٹُنّی جانے کو تیار ہوئیں۔ تھراتے ہوئے ہاتھوں سے انہوں نے برقعہ پہنا .... وہ رو نہیں رہی تھیں لیکن آنکھوں میں چمکتا ہوا پانی، ہلکے ہلکے جُنبش کرتے ہوئے ہونٹ، بار بار جھپکتی ہوئی پلکیں، لرزتی ہوئی اُنگلیاں اُس آتش فشاں کا پتہ دے رہی تھیں جسے ضبط وتحمل کے برف سے ڈھانکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

وہ میرے ساتھ بگھی پر بیٹھیں۔ میرے ایک ہاتھ کی اُنگلی بہن نے تھامی دوسرے ہاتھ کی اُنگلی اماں نے تھامی، جیسے اُنہیں ڈر ہو کہ اُن سے مجھے کوئی چھین لے گا .... دونوں بار بار میرا مُنھ دیکھتی تھیں اور گم سم تھیں، ہم لوگ پٹنہ جنکشن اسٹیشن پر آئے۔ پلیٹ فارم پر پہونچے .... یہاں دونوں میں سے کوئی بھی رونا ضبط نہ کر سکا۔ بہن زور سے رو پڑی، ماں پر بھی رِقت طاری ہوئی حالانکہ رونے کی بظاہر کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ لیکن انھیں ایک درجہ ملنے والا تھا اللہ نے انہیں شہادت کے لئے قبول کیا تھا، وہ قتل گاہ کی طرف جا رہی تھیں، ان کے دل کے پردے اُٹھ گئے تھے کثافت دُور ہو چکی تھی لطافت اور رقت غالب تھی لیکن میں اُس وقت یہ سب کیا جانتا۔ مجھے ان کے جانے کا غم بیشک بہت تھا لیکن ایک حد تک رنج بھی تھا یہ لوگ کیوں جا رہی ہیں، کیا قربانی یہاں نہیں ہو سکتی ہے؟ ....

مجھے کیا خبر کہ مشیت نے کیا فیصلہ کیا ہے، یہ قربانی کرنے کو نہیں قربان ہونے کو جا رہی ہیں..... .... لیکن اُس روز کے بعد سے اُس وقت کا منظر جس وقت یاد کرتا ہوں تو آنسو نہیں تھمتے۔ اور اِس وقت بھی جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں دونوں صورتیں میرے سامنے ہیں، ستائیس سال بعد بھی ان میں سے کوئی بوڑھی نہیں ہوئیں، دونوں کے خط و خال وہی پیش نظر ہیں .... وہ صورتیں جو کیفیت دل میں اِس وقت پیدا کر رہی ہیں اور اِن آنسوؤں میں جو لذت مجھے مل رہی ہے، یہ میری زندگی یہی میری جان یہی میرا فن ہے۔

اسی کی رعنائی اور تازگی ہے۔ اس کی لذت، اس کی قیمت میں ہی جانتا ہوں۔

میرے غم کی قدر و قیمت کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ چراغ وہ ہے جس سے میرے گھر میں ہے اُجالا

اسے کوئی خرید نہیں سکتا، اس کی قیمت کوئی دے نہیں سکتا، دے تب بھی لے نہیں سکتا۔ اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ کوئی دولت، کوئی طاقت، کوئی سانحہ، کوئی انقلاب، کوئی حادثہ اس کی جگہ لے نہیں سکتا۔

تیرا درد اتنا بڑا حادثہ ہے
کہ ہر حادثہ بھول جانا پڑے ہے

گاڑی آئی اور روانہ ہوئی، دُور تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ماں کا نصف کھُلا ہوا چہرہ کروٹ کے بل کھڑکی سے باہر تھا......... بہن دونوں ہتھیلیاں کھڑکی پر ٹیکے پوری گردن نکالے ادھر دیکھ رہی تھی......... وہ دونوں رو رہی تھیں اسلئے کہ انہیں پھر رونا نہیں تھا۔ میں خاموش ...... کچھ غم کچھ غصہ میں خاموش تھا اس لئے کہ مجھے پھر عُمر بھر رونا تھا۔

میرے لئے قیدِ سحر و شام نہیں ہے
روتا ہوں کہ رونے کے سوا کام نہیں ہے

۲۶ر اکتوبر کو وہ دونوں گئیں اور ۲۸ر کو خبر ملی کہ چھپرہ میں فساد ہو گیا ہے .... اور پھر وحشت ناک خبروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آخر ۴ر نومبر کو کسی طرح سے یہ خبر آئی کہ تیلیاباڑہ ۳ر نومبر سے محاصرے میں ہے، دس ہزار کے مسلح مجمع نے ۴ کے سہ پہر سے حملہ کر دیا ہے۔ یہ خبر سُننا تھی کہ شروع یادداشت سے ۲۶ر اکتوبر کی صبح تک کا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا .... وہ تمام تصویریں جو شعور کے آئینہ خانہ میں آویزاں تھیں، وہ تمام جلوے، وہ تمام مناظر .... وہ کتابِ گُل ولالہ وہ بیاضِ گلشن .... وہ کلیاں وہ کوچے وہ صحن وہ مکانات وہ خلوتیں وہ انجمنیں وہ تمام اہل انجمن وہ تمام نسرین و یاسمن وہ تمام نرگس و نسترن وہ تمام گُل بوٹے وہ تمام شاخیں وہ تمام ڈالیاں سینما کے پردوں کی طرح تیزی سے سامنے آنے لگیں۔

جانے اُس انجمنِ شوق کا کیا نقشہ ہے
نہ وہاں سے کوئی آتا ہے نہ ہم جاتے ہیں

دل میں پنکھے لگ گئے۔ میں اور میرے دو ایک عزیز ۴ر نومبر کی دوپہر سے رات گئے تک اور پھر ۵ر نومبر کی صبح سے سہ پہر تک مختلف آستانۂ ناز کی خاک چھانتے رہے، ۵ر کی صبح سے بالخصوص ایک معزز ذمہ دار ڈاکٹر صاحب جو اُس وقت پورے صوبے کے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے، کے درِ دولت پر ایک پاؤں پر کھڑے رہے، کہاں کی بھوک اور کہاں کی پیاس۔

دل ہی کی حالت دِگر گوں تھی چہرے کا کیا پوچھنا .... بار بار درخواست پیش کر رہا ہوں
"حضور کوئی سامان کر دیجئے .... ایک دو ٹرک مل جائے تھوڑے سے محافظ ....
کچھ مدد کیجئے" .... "ارے میاں سوچنے دو .... کیا پریشان کر رکھا ہے.
.... میں کیا کر سکتا ہوں" ؟ ان کے ملنے والے آتے رہے، مزاج پُرسی ہوتی رہی، گھر
کے حال احوال کہے اور سُنے جاتے رہے۔ رات کے کھانے کی تفصیل، صبح کے ناشتے کی تفصیل،
بچّے کے ختنے کی بات، مفلر خریدنے اور گرم شیروانی سلوانے کی بات اور درزی کی سلائی
بٹن کی قیمت کی بات اور فلاں صاحب کے یہاں رات کو ولیمے کی دعوت کی بات اور دستر خوان
کی لمبی تفصیل مُرغ مُسلّم قورمہ مچھلی کے کباب کی بات، وہ تمام باتیں جو ڈرائنگ روم میں کی جاتی
ہیں کی جارہی تھیں اور اُسی ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس کچھ بھوکے پیاسے غم زدے
جن کے نہ دل ٹھکانے تھے نہ دماغ، ایک پاؤں پر کھڑے دیوانوں کی طرح مُنھ دیکھ رہے ہیں..
.... "حضور! .... ڈاکٹر صاحب! بہت دیر ہو رہی ہے ....
ڈاکٹر صاحب کچھ انتظام فرما دیجئے" .... "ٹھہریئے صاحب .... آپ لوگ تو
بالکل جان ہی کھا رہے ہیں۔ ٹھکانے سے بات بھی کرنے نہیں دیتے ....
ہاں بھائی تو بریانی بڑی روغن دار تھی ...... ایں؟" .... "کیا کہوں بھائی صاحب!
دو بار صابُن سے ہاتھ دھوئے مگر رومال دیکھئے (جیب سے رومال نکال کر) کتنا روغن

رُومال میں موجود ہے"............ "حضور...... ڈاکٹر صاحب! اب تو دوپہر گذر رہی ہے، خدا جانے وہاں کیا عالم ہو رہا ہوگا، نہ جانے لوگ کس حال میں ہیں........ ذرا رحم فرمائیے ڈاکٹر صاحب ......" .... "افوہ! ارے بھائی کوئی ہے؟ ذرا آئی جی صاحب کو ٹیلیفون پر بُلاؤ .... ہاں جناب تو آپ نے خوب مُرغ کی ٹانگ توڑی اور خوب بریانی اُڑائی .... (مہمان کے ساتھ کے بچے سے مخاطب ہوکر) میاں آپ نے بھی خوب کھائی ہماری یاد نہیں آئی؟ برخوردار تھوڑی ہمارے لئے بھی لے آتے .... اچھا عزیزم خوش رہو، آیندہ ایسے موقعوں پر ہمیں نہ بھولنا .... ہاہاہاہا .... بڑا پیارا بچہ ہے ...... اللہ حیات میں ترقی عطا فرمائے" .... دوپہر سے تین بج گئے، آئی جی صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ ایک ٹرک اور چھ ملیٹری کا انتظام ہوا .... ہم لوگ اُن کے بنگلے سے نکل کر ٹرک پر بیٹھ رہے ہیں کہ دو تین گاڑیاں اور ٹرک سامنے آکر رُکیں۔ ان پر سے کچھ مُسلم کچھ غیر مُسلم لوگ اُترے۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک صاحب اُدھر بڑھے ...... اور ایک صاحب سے مخاطب ہوکر بیقراری سے پوچھا "کہاں سے آرہے ہو محبوب صاحب؟ (محبوب احمد سابق لفٹننٹ آئی۔ این۔ اے سُبھاش بوس برگیڈ)"۔ ہم لوگ تو تیلہاڑہ جارہے ہیں، ایک ٹرک اور چھ ملیٹری کا نظم ہوا ہے"...... محبوب صاحب نے ایک آہ کی "آہ اب تیلہاڑہ میں کیا

رکھا ہے ؟ وہیں سے آرہا ہوں ۔ میرا اور میرے ساتھیوں کے کپڑے دیکھو (تمام خون کے داغ تھے) لاشوں کو ٹھکانے لگاکر آرہا ہوں .... بستی ختم ہوگئی .... تمام مکانات جل گئے .... سب لوگ شہید ہوگئے ...."

میرے ساتھ اور لوگوں کا کیا حال ہوا مجھے یاد نہیں، خود مجھے اپنے حال کی خبر نہیں۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ میں ایک دیوانگی کے عالم میں چیختا ہوا ڈاکٹر صاحب کے بنگلے کی طرف پھر واپس دوڑا .... "ڈاکٹر صاحب ! ڈاکٹر صاحب !! ڈاکٹر صاحب !!! آئیے .... اپنے مہمانوں کو بھی ساتھ لائیے۔ اُن کے رومال کا روغن دیکھا .... اِن کے دامنوں کا بھی روغن دیکھئے .... کچھ اور لوگ بھی دعوتوں سے آئے ہیں ....

ڈاکٹر صاحب ! اِس دعوت میں شریک نہ ہونے کا آپ کو عُمر بھر افسوس رہے گا۔ کیا دسترخوان تھا ڈاکٹر صاحب۔ اتنا وسیع دسترخوان کہاں بچھ سکتا ہے ڈاکٹر صاحب .... سینکڑوں مُرغ مُسلّم ڈاکٹر صاحب ! .... ارے ڈاکٹر صاحب آپ کی اداؤں پر تو برات کی برات قربان ہوگئی .... ڈاکٹر صاحب ! اب اپنی شیروانی بڑے ناز سے پہنئے گا اور پہن کر آئینے میں ذرا اپنی سج دھج دیکھئے گا جس کا ہر ٹانکہ ایک سِسکتا ہوا دل ہے، جس کا ہر بخیہ ایک روتی ہوئی آنکھ ہے .... اس کی تراش خراش میں کتنی صراحی دار گردنوں کا خم شامل کیا گیا ہے، اس کا ایک ایک دھاگا کتنی شہ رگوں سے

بنایا گیا ہے .... ڈاکٹر صاحب! یہ شیروانی پہننے سے زیادہ کسی آئینہ خانے میں سجانے کے قابل ہے، کہ قیامت تک زیارت گہِ خاص و عام رہے۔"

دوسرے دن ملیٹری ٹرک سے کچھ بچے کھچے زخمیوں کا قافلہ آیا۔ ڈاکٹر اعظم صاحب، قاضی سراج الحق صاحب بھکیت تھے، بہت کم زخمی تھے۔ قاضی نصیر حسین صاحب کا سُرخ و سفید گول بدن پہچانا نہیں جاتا تھا .... اور لوگ؟ چند زخمی بزرگ اور جوان .... کچھ بے حد زخمی مستورات، دو ایک نیم مُردہ بچیاں .... اور لوگ؟

محفل محفل ڈھونڈھ رہے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے ہم

اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں دھڑکتے ہوئے سینے کے ساتھ کیمپوں میں .... اسپتال میں مارا مارا پھرتا رہا .... زخمیوں پر دیوانہ وار گرتا رہا، دوڑتا رہا .... آواز دیتا رہا .... "امّاں! ...... امّاں!! مُنّی! .... رشیدہ!!"

کہیں کہیں کوئی پہچانی صورت نظر آجاتی ...... "کون درگاہن خالہ؟" .... خون میں لتھڑی ہوئی۔ "ہاں کلیم میں ہوں" ...... "اور حُسنا خالہ؟ ..... چندا نانی؟ قیسمن نانی؟ اور بتاؤ درگاہن خالہ ...... میری امّاں؟ .... اور مُنّی؟ ...... رشیدہ؟ ...... کوئی نہیں؟ ...... کوئی نہیں؟ ...... کوئی نہیں؟"

مجھے یاد نہیں کیمپ اسپتال سے مجھے کون لایا۔ دو روز تک نیم بیہوشی کے عالم میں رہا۔

تیسرے روز کیمپ میں بات چل رہی تھی ...... کہ امّت بوبو (میری ماں کا نام) اور بُجّی رشیدہ کہیں کمرے میں چھپی ہوئی ہیں، پوشیدہ ہیں۔ تیسرے ہی روز میں اور میرے بہنوئی اکرام الحق مرحوم ایک ٹرک پر کچھ مدراسی فوجیوں کے ساتھ تیاہاڑہ بستی گئے۔ ٹرک پر کچھ نرم گدّے کچھ برتنوں میں دُودھ شکر رکھ لئے گئے۔

بستی میں سب سے پہلے سنگی جامع مسجد ملتی ہے .... آبادی سے کنارے ایک بلند مقام پر بہت دُور سے نظر آتی ہے .... دُور ہی سے ایسا معلوم ہوا کہ مسجد کچھ کہہ رہی ہے۔ اُس کا ایک حزن جلال آمیز، ایک اندوہ وقار آمیز، ایک پُر شکوہ افسردگی .... مسجد کا انداز ایک تھکے ہوئے زخموں سے چُور جھُومتے ہوئے مجاہد کا سا تھا۔ جنگ میں سینہ سپر ہو کر لڑا ہوا مجاہد، ساتھیوں کی لاشوں کے درمیان تلوار ٹیکے گر کر مرنے پر آمادہ نہیں ...... مسجد کا دروازہ سینے کے زخم کی طرح کھُلا ہوا تھا۔ اور وہ تمام علامات اور نشانیاں اسکے در و دیوار سے نمایاں ہو رہی تھیں جو سہ روزہ تصادم اور کشمکش کی زندہ تصویریں تھیں ۔

۵ ر نومبر مُطابق ۱۰ ر ذی الحجہ جس وقت دوگانۂ عیدالاضحیٰ پڑھی جاتی ہے نُو بجے صبح اُس حادثۂ عظیم کا اختتام ہوا جسے اِس دُنیا میں صبح و شام یاد کرنے والا شاید میرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے .... جیسے جیسے ہم لوگ مسجد کے قریب گئے، ایسا معلوم ہوا جیسے مسجد پُکار رہی ہو :-

"آنے والو سنبھل کر آئیو۔ دیکھ کر آئیو ...... یہ وادیٔ مقدس ہے ....
اپنے جوتے اُتار کر آؤ .... احترام سے آؤ .... سر جھکائے ہوئے آؤ،
سلام کرتے ہوئے آؤ .... بلکہ نہ آؤ۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیرِ قدمت ہزار جانست

کیوں آتے ہو؟ .... کیا دیکھنا چاہتے ہو؟ اب کیا دیکھوگے .... کون تمھیں
دِکھائے گا، کون تمھیں بتائے گا .... وہیں کھڑے رہو ...... وہیں سے سنو........
میں بتاؤں گی۔

ہوشیاروں کو نہیں معلوم رازِ فصلِ گُل
مجھ سے پوچھو میں اسی موسم میں دیوانہ بنا

میری پتھر کی دیواروں میں شرارے رقصاں ہیں .... میرے پتھریلے سینے میں دھڑکتا ہوا
دل ہے۔ یہ محرابیں ابرو ہیں، یہ طاق آنکھیں ہیں .... میں تمھیں وہ زبان دوں گی
جو تم آیندہ بولو گے، وہ خیال دونگی جو تم آیندہ سوچو گے، میں جو کہوں گی وہ تم سمجھو گے
پھر تم اوروں کو سمجھا لینا۔ لیکن تم بھی کیا سمجھو گے اور کتنا سمجھاؤ گے۔

ادا کیونکر کرینگے چند آنسو دل کا افسانہ بہت دُشوار ہے جتنا سمجھنا اتنا سمجھانا

میں نے تین دن، تین راتیں، تین صبحیں، تین شامیں تڑپتے اور کراہتے گذاری ہیں.....
اِن کراہوں کو تم سمجھو گے، اِن سے تم استعارے بناؤ گے ...... میں کبھی تنہا نہیں رہی تھی -
میرا پہلو ہمیشہ آباد رہا تھا .... لیکن تین دنوں تک میرے قریب کوئی نہ آسکا.......
اِس بلندی سے میری دیواریں پکارتی رہیں - میرے مینارے چیختے رہے .... لیکن
تین دِنوں تک میری مجلس گرمانے والے کسی اور ہی گرمئ بازار میں مصروف تھے - میرے
ہم نشین تین روز تک ایک ایسی عبادت، ایک ایسی نماز میں مشغول رہے جس نے انہیں
تمام عبادتوں اور نمازوں سے ہمیشہ کیلئے فارغ کردیا - تین روز تک میدانِ وفا گرم رہا -
تین روز تک گردن و سر میں راز و نیاز ہوتے رہے - دیکھو .... بالکل میرے
قریب ہی سے سرحدِ عشق شروع ہوتی ہے، یہیں سے امتحان گاہِ وفا کی راہ نکلتی ہے ....
دیکھو میرے دروازے سے ہی دیکھتے چلو، تصویریں لیتے چلو اور اپنے دل کے آئینہ خانے کو
سجاتے چلو ...... دیکھو ٹھیک چوکھٹ کے قریب شاہ عبدالحفیظ ہیں، وہی جو ہمیشہ
میرے سامنے اگلی صف میں رہا کرتا تھا - اِس وقت بھی اُسے صفِ اوّلیں ہی میں پاؤ گے...
.... وہ بھاگتا ہوا میری آغوش میں آرہا تھا، چوکھٹ پر قدم رکھا ہی تھا کہ شمشیر
نازِ معشوقانہ کرتی ہوئی پیشانی چُوم گئی - وہیں چار زانو بیٹھ گیا اور جھومتا رہا ....
اور اس کے قریب ہی معین الدین حیدر ہیں - یہ دونوں دیوانے ساتھ ساتھ رہے اور

ساتھ ساتھ ہیں .... ذرا اور آگے بڑھو تو دیوار سے متصل میرا امام سیّد اطہر حسین ہے اور اس کے بالکل قریب ہی اس کا بڑا بھائی واعظ الحق۔ تم ان دونوں کی محبت بھی جانتے تھے، محبت ہی کے لئے جان دے دی .... یہ سب کشتگانِ عشق ہیں، مر کر زندہ ہوگئے ہیں...

.... آگے بڑھو .... ذرا سنبھل کر بڑھیو، ورنہ کتنے سروں سے ٹکراؤگے، کتنے بازوؤں سے ٹھوکر کھاؤگے، کتنے گیسوؤں سے الجھوگے، کتنے سینوں پر تمہارا پاؤں پڑجائے گا

.... دیکھو یہ کون ہیں؟ .... داروغہ محمد یوسف۔ دفتر کے باہر کبھی وردی نہ پہنا، کھدر اوڑھنا کھدّر بچھونا۔ کھدّر کا پاجامہ کھدّر کا کُرتہ کھدر کی ٹوپی کھدر کا کوٹ، بانس کی چھڑی، کبھی پیشانی پر بل نہ تھا، ریٹائرڈ ہو کر گھر بسنے آئے تھے، بستے ہی گھر بھر کو اجڑوا گئے۔ دیکھو اسی کھدر میں لپٹے پڑے ہیں، کھدر ہی کا کفن ملا۔ ایسے وضع دار لوگ کم ہوں گے .....

.... اور دوسرے کھدر پوش کو پہچانو ...... پہچانتے ہو؟ ...... نہیں پہچانتے۔ ارے میاں ذرا چہرے سے ان کی کھدر کی آستین ہٹاؤ ...... یہ ہمیشہ چہرے پر یوں ہی آستین رکھ کر سوتے تھے، آخری نیند میں بھی اُسی انداز سے پڑے ہیں .... ارے یہ ہیں تمہارے مفتی عبدالحفیظ نانا .... کم گفتار تیز رفتار، کھدر کی شیروانی، کھدر کی چنچ ٹوپی ٹوٹی چپل ...... یہ ہمیشہ سب سے پہلے مسجد میں آتے اور سب سے آخر میں جاتے تھے ....

میرا بڑا پرانا یار تھا مگر بڑا بے وفا نکلا .... دو بات بھی نہ کی، روٹھا پڑا ہے ....

دیکھو یہ تمہارے محمدؔ و نانا ہیں .... اِس عمر میں شہادت لکھی تھی .... اور یہ دیکھو تمہارے ظہورؔ نانا ہیں .... اور ان کی بغل میں دیکھو وہی ہیں جو قاضی صاحب کو پیار سے "کاجی پھچاک" کہا کرتے تھے مر کر بھی پیار کا ثبوت دیا، بغل بغل ہی میں دونوں پڑے ہیں .... یہ سب عاشقانِ ناز تھے .... اس عمر میں بھی اِن کے شوق کا عالم کیا بتاؤں، قاتل کی تلوار سے یوں لپک لپک کر گلے مل رہے تھے جیسے کوئی محبوب سے ملتا ہے۔

لپٹ لپٹ کے گلے مل رہے تھے خنجر سے
بڑے غضب کا کلیجہ تھا مرنے والوں کا

میں دیکھتی رہی اور تلوار کی قسمت پر رشک کرتی رہی۔ یہ سب میرے محبوب تھے ...... میرے عاشقانِ ناز تھے ...... میں نے انہیں شعورِ عشق دیا تھا، اِن کے جذبۂ شوق کی پرورش اور نشو ونما میری آغوشِ تربیت میں ہوئی تھی .... یہ میری خلوت و جلوت کے راز دار تھے اور میرے بڑے ناز بردار .... اور یہ دیکھو یہ قمر العرب ہیں ...... کم گو، کم سخن، کم آواز .... اس کی سیاہ داڑھی پر ترکی ٹوپی مجھے بڑی پیاری لگتی تھی .... اور ان کی بغل میں دیکھو .... نہیں پہچانتے؟ ارے میاں تم تو بڑے طوطا چشم ہو، صبح و شام کے اپنے ہم نشیں کو نہیں پہچانتے؟ کیا ذرا کروٹ پڑے رہنے سے، چہرہ ذرا اوجھل کرنے سے پردہ داری ہو گئی؟ ارے پاؤں کی طرف دیکھو۔ کیا

سفید کنواس کا باٹا شو نہیں پہچانتے ؟ ارے سر دیکھو ...... سنگر ہار کے پھول اور گھنگھریالے بال ! .... بس تڑپ گئے نا، نیم بسمل ہو گئے نا ؟ ..... شاہ دمو ...... شاہ بدرالدین ...... دمڑ شاہ ۔ اِک اِک میاں کے تین تین نام ...... جو نام بھی لو .... یا کوئی نام نہ لو۔ اب ان کو صرف سنگر ہار کے پھولوں والے کہا کرو .... یہ لونڈا بھی میرا عاشقِ زار ہی تھا، پھُدکتا ہوا ہر جمعہ کو میرے پاس آتا تھا۔ یہ سب میرے چشم و ابرو کے دلدادہ تھے۔ زندہ بھی میرے قریب رہے اور جان بھی میرے آستانۂ ناز پر ہی دی ...... بڑے وضع دار تھے، وفا پر مٹنے والے .... قاتل کی تلوار تو تین روز سے پیچھا کر رہی تھی لیکن آخری سجدہ تو انہیں میرے ہی قدموں پر کرنا تھا، تیغِ قاتل کو بھی اِن کی ناز برداری کرنی پڑی .... تین روز تک انتظار کرنا ہی پڑا .... یہ سب میرے قدموں میں پڑے ہیں۔ اِن کی عمر بھر کی بیقراری کو قرار آگیا۔

اچھا اب ذرا آگے بڑھو ...... مگر ...... سہمے سہمے بڑھو دل کو تھامے بڑھو ...... ہوش کھونا نہیں لڑکھڑانا نہیں .... دیکھو اس مکان کو پہچانتے ہو ؟ .... وہ مردِ بذلہ سنج، حاضر جواب، زندہ دل، مجلس آرا صاحبِ کیف و حال ماسٹر یعقوب ۔ وہ ستر سال کا بوڑھا جس نے سر دیا مگر کسی کے ہاتھ پر ہاتھ نہیں دیا۔ پورے کُنبے کے ساتھ ...... جان دے دی مگر اک آہ نہ کی ـــــ آگے بڑھو، سرسری اِس جہان سے مت گذرو ۔

یہاں ہر قدم پر اک جہانِ دیگر ملے گا .... آگے بڑھو .... دیکھو یہ کیا ہے ......؟
پہچانتے ہو یہ کس رشکِ مسیحا کا مکان ہے؟ آہ مکان کہاں ہے۔

غبارِ کارواں سے کارواں کو ہم نے پہچانا
جہاں تھی شمع روشن اُڑ رہی ہے خاکِ پروانہ

در و دیوار سے بھی نہ پہچان سکو گے۔ لیکن پہچاننے کی کوشش کرو .... دیکھو سخیا کی آواز آ رہی ہے:

مُرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع

اور وہ دیکھو ایک سریلی آواز اور گونجی ...... آرزو ہے وفا کرے کوئی ؎ ہم کو چاہے خدا کرے کوئی ...... آہ حفیظ بھائی ...... ہاں ...... دیکھو یہ وہی مکان ہے جس میں تمہاری اکثر شامیں گذرتی تھیں ...... سخیا کی آواز، بہادر شاہ کی غزلیں، شاعرانہ مباحثے علمی مذاکرے، ماسٹر یعقوب صاحب کے چٹکلے، معین الدین حیدر کے لطیفے ....
یہی وہ مکان ہے جس میں تین روز تک بیسویں صدی کے کربلا کا میدان گرم رہا ....
تمام بستی کے لوگ جمع تھے۔ بوڑھے جوان، بچے بچیاں .... کنواری دوشیزائیں، جوان بیبیاں، بوڑھی عورتیں، کچھ بستی کے تلوریئے بھی تھے اور بنوٹیئے بھی، لڑنتئے بھی، بیمار بھی، قوی بھی، ناتواں بھی، رند بلا خوار بھی اور زاہد شب زندہ دار بھی، اپنے اعمال پر

ناز کرنے والے بھی اور بے عملی پر رونے والے بھی، یہاں سب ایک ہو گئے تھے........
تین دن تک بے آب و دانہ .... دوسرے دن سے تو واقعی نہ دانہ تھا نہ پانی ......
کربلا میں اہلِ بیتِ امام پر تین روز تک دانہ پانی بند تھا........ وہ محرم الحرام کے عشرۂ اوّل کے آخری تین دن تھے اور یہاں ذی الحجہ کے عشرۂ اوّل کے آخری تین دن - وہاں بھی یزید کا حکم تھا کہ "بشر پئیں حیوان پئیں چرند پئیں پرند پئیں، کُتّے بھی گر پئیں تو تم منع کیجیو اِک فاطمہ کے لال کو پانی نہ دیجیو" ـــــ یہاں بھی تلواروں اور برچھوں کی باڑھ باندھ دی گئی تھی - پہلے دن تو کچھ بچا کھچا چلا - اُسی شام سے فاقہ شروع ہوا - اور تین دن تک اُسی تشنگی اور گرسنگی کے عالم میں بہادروں نے تلواروں کو ہاتھوں پر روکا، گولیوں کو سینے پر لیا، ڈھیر ہو گئے لیکن سیر نہیں ہوئے، ٹوٹ گئے لیکن مُڑے نہیں....... اِسی مکان میں تمہارا حبیب .... ارے وہی .... "شیروانی کے بٹن کھُلے ہوئے - ترکی ٹوپی.....
سیاہ بوٹ .... شیروانی کا بٹن ہاتھ میں تھامے ہوئے!" .... جب پیٹ میں بھالا لگا تو بھالے کی لکڑی ہاتھوں سے پکڑی اور زور سے بولے ..... بھیّا! (شاہ عبدالحفیظ) بھاگ جائیے بھیّا ...... نکل جائیے بھیّا ...... مجھکو یہیں چھوڑیئے بھیا ...... السّلام علیکم ......
اور تمہارے حفیظ بھائی کی وہ نازک کمسن بچیاں شکیلہ، نور جہاں ...... یاد ہیں؟ تمہیں تشتری میں امّاں سے مانگ کر حلوا کھلایا کرتی تھیں؟ .... وہ اور اُن کی ہم عمر

نہ جانے کتنی بچّیاں .... آخر دن جب سارے محاذ ٹوٹ گئے، دیواریں گرا دی گئیں، چاروں طرف آگ لگا دی گئی، بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تو کمسن بچّیاں اپنی ماؤں کے اشارے پر تیمّم کر کے قطار سے رحلوں پر قرآن رکھ کر بیٹھ گئیں اور جھوم جھوم کر تلاوت کرنے لگیں .... کمسن آنکھوں کی ننھی بُوندوں کو ڈوپٹے سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی... تلواروں والے اور برچھوں والے آئے اور ایک سلسلہ سے ....
اور قرآن پڑھنے والیاں مالکِ قرآن کے آگے قرآن پر ہی ہمیشہ کے لئے سجدہ ریز ہو گئیں... .... وہ تمہارا پھکیت لڑنتیہ سراج الحق .... بھوک پیاس میں تین روز ڈٹا رہا۔ جب آخری ہلّہ آیا ایک ضرب ایسی لگی کہ گرا .... لوگ تلواریں اور برچھے لیکر ٹوٹ پڑے .... سراج کی بیوی اور سراج کی بھاوج سراج پر یوں گر پڑیں کہ خود کو ترشوا دیا اور اُسے بچا لیا۔

اے عشق! مل سکیں گے نہ ہم جیسے سرپھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

چلو آگے بڑھو...... چلتے رہو...... وقت کم ہے نمائش گاہ بڑی ہے۔ ٹھہرنے کا مقام کہیں نہیں۔ ٹھہرو گے تو پاگل ہو جاؤ گے۔ میں اِس بلند مقام سے اپنے میناروں کی نگاہوں سے سب دیکھتی رہی ہوں اور تڑپتی رہی ہوں اور کبھی جھومتی رہی ہوں۔ تڑپنا درس تھا اور

جُھومنا فخر سے .... میں پہلے ہیرا تھی، اب پتھر ہو گئی ہوں۔ میرے سینے پر سب نقش کالجر ہے۔ موسم آئینگے جائینگے، طوفان آئینگے گذر جائینگے، نسلیں پیدا ہونگی اور مٹ جائینگی، لیکن میں اپنے سینے پر یہ موتی سجائے کھڑی رہوں گی۔ تم محبت سے دیکھو گے اور لوگ حیرت سے دیکھیں گے۔ کوئی نفرت سے دیکھے گا۔ لیکن محبت حیرت نفرت یہ موسمی پھول ہیں فنا ہو جائیں گے۔ میرے سینے کے پھول لافانی ہیں .... آگے بڑھو دیکھو یہ تمہارے ظفر آمام بھائی کا مکان ہے۔ وہ وضع دار، خوش رُو، جامہ زیب غالب کی مجسّم غزل، غالب کی غزل کا رسیا .... زخموں سے چور چور اپنی چہیتی کنواری ہنس مُکھ بچی کو پُکارتا پھرتا تھا .... وہ کہاں سے جواب دیتی .... دُور تھی .... اور جواب دیتی بھی تو کُنوئیں سے آواز نکلنی مشکل تھی .... ہاں دیکھو ہر گھر میں کتنے کُنوئیں ہیں .... ہر کُنوئیں کے کنارے پر آواز دو .... مگر نہیں، ٹھہرو۔ یہ غلط بات ہے۔ تم سب کے محرم نہیں ہو اور وہاں پردے کا کوئی انتظام نہیں ہے .... ان کُنوؤں میں کتنی کنواریاں ہیں جن کے پاؤں کی چاپ سُن کر سناٹے اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے .... کتنی پردہ نشیں شریف زادیاں ہیں جنہیں دن کی دُھوپ اور رات کی چاندنی بھی شرما شرما کر دیکھتی تھی .... کتنی جوان بیویاں، کتنی ضعیف مائیں جن کے تقدس اور عصمت کے ذکر کے سامنے وقت عظمت اور احترام سے جُھک جاتا تھا .... کتنی ہوں گی جن کی حسین چوٹیاں ان کا آخری وسیلۂ نجات بنیں۔

کتنوں نے اپنی آنچلوں کو گلے لگا لیا........ اور کتنی بہادر تیں ایسی بھی تھیں جو خنجر لے کر کود پڑیں کہ ہم بھی نہیں اور تم بھی نہیں....... اور یہ سب قیامت تک ان کنوؤں میں اپنی خاموش انجمنیں آراستہ رکھیں گی...... ان میں زخموں کے چراغاں ہوں گے، آہوں کی قندیلیں روشن ہوں گی، ترشی ہوئی گردنوں کے فانوس جھومیں گے........ اس طرح یہ انجمن میدانِ حشر میں اپنے بنانے والے کے سامنے چلے گی اور اِن کا بنانے والا حشر والوں سے پکار کر کہے گا... .... اِنہیں راستہ دو....... حوریں آؤ اور اپنی زلفوں سے جاروب کشی کرو....... فرشتو اِن کے لئے اپنے پَر بچھاؤ....... یہ وہ ہیں جنہوں نے جان بیچ کر آبرو خریدی ہے اور خریدی اس لئے کہ میرے سامنے یہی تحفہ لیکر آئیں........

اچھا اب کب تک غزل سنو گے۔ بہت اشعار کہہ دیئے، اب زندگی بھر اِن طرحوں پر اشعار کہتے رہو گے...... ہاں اب مقطع سُن لو...... ذرا آگے بڑھو..... دیکھو وہ حضرتِ صدرامین کا مزار مبارک ہے...... اُس مزار کے پائنتی جاؤ.... آگے بڑھو.... مگر ٹھہرو.... سنو...... دیکھو تمہیں زندہ رہنا ہے........ میں نے تمہیں اپنا رازدار بنایا ہے .... میری بات تم سمجھ سکتے ہو سب نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن میری بات تمہاری زبان میں سب سمجھیں گے.. ...... میں نے تمہیں محرمِ راز اِسی لئے بنایا ہے کہ تم زبان بنو میں دل بنوں۔ میں تمہیں دل دیتی ہوں تم مجھے زبان دو گے........ اس لئے تمہیں زندہ رہنا ہے....... آگے بڑھو

کلیجہ سنبھال کر آگے بڑھو .... ہمت کرکے حوصلہ کرکے آگے بڑھو ..... دیکھو حضرت صدر امین کے پائنتی کنواں ہے .... ارے میاں یہ کیا ؟

موسمِ گُل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے
تم تو بس سُنتے ہی عاجزؔ دیوانے ہوجاؤ ہو

میں سمجھ رہی تھی کہ مقطع کے نام سے تم کچھ سمجھ گئے ہو .... لہجہ شناس ہو رمز آگاہ ہو ..... وجدان و عرفان کے بڑے ہو تو ہمت اور حوصلے کے بھی بڑے ہو ..... لڑکھڑاؤ نہیں ، قدموں کو قابو میں رکھو .... ارے میاں یہ تو راہِ محبت ہے .... اس میں تو مقاماتِ سخت آتے ہی ہیں اور آئینگے ہی .... اگر ہمت ہار و گے تو یہ امانت کیسے سنبھالو گے جو میں تمہارے سپرد کر رہی ہوں۔ تم ہی کو ایک دن یہ کہنا ہوگا :

اِس انجمن میں ہم بھی عجب وضعدار ہیں
دل ہے لہو لہان جبیں پر شکن نہیں

اور یوں بھی کہو گے :

غزل جو سُنتا ہے میری عاجزؔ وہ مجھ کو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گذری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے

قیامت گذر جائے تو گذر جائے مگر آگے بڑھو .... ہاں تو مزار کے قریب وہ کنواں ہے...

تم اُدھر جا سکتے ہو .... اُس کنوئیں کے لئے پردے کی کوئی ضرورت نہیں، تم اُن کے محرم ہو .... کن کے؟ .... وہی جن کو تم پکارا کرتے تھے "امّاں! ...... تم کہاں بیٹھی ہو امّاں"! .... چلو بڑھو پھر آواز دو .... "تم کہاں ہو امّاں"؟ پکارو.... "منّی کہاں ہو؟" پکارو .... "رشیدہ کہاں ہو"؟ .... دیکھو آواز آرہی ہے ..... "میں یہاں ہوں بیٹا"...... دیکھو آواز آرہی ہے .... "میں یہیں ہوں بھیّا" .... "ہم لوگ یہیں ہیں بیٹا .... قرآن پڑھ رہی ہوں بیٹا"........... "ہم امّاں کے گلے سے لپٹے ہوئے ہیں بھیّا"

.... "ہم دونوں ایک ہی رشتے میں چھدے ہوئے ہیں بیٹا ....

بیٹا تمہیں یاد ہے؟ .... تم انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے۔ پٹنہ میں پڑھ رہے تھے، تمہارا ٹسٹ ہونے والا تھا۔ میں ٹائیفائیڈ میں مُبتلا ہوئی .... گھر میں صرف میں تھی اور یہی تمہاری مُنّی، ایک ماما ایک ملازم، ایک ماہ ٹائیفائیڈ میں رہی لیکن تمہیں خبر نہیں دی۔ مُنّی سے خیریت لکھوا دیا کرتی تھی۔ نہ جانے تمہیں کیسے خبر ہوگئی۔ تم راتوں رات پٹنہ سے تیلہاڑہ آئے۔ دو بجے رات میں تم پکار رہے تھے۔ میں اچھی ہو چکی تھی کمزور تھی۔ ماما نے دروازہ کھولا۔ تم آکر لپٹ گئے ...... امّاں مجھے خبر تک نہ دی؟ ...... میں نے کہا بیٹا تو پڑھنے میں مشغول تھا، تجھے کیوں پریشان کرتی ..... مر بھی جاتی تو کوئی بات نہ تھی، تم آکر مٹی تو دے ہی دیتے .... بیٹا اللہ نے میری بات سچ کر دی اور تمہیں بھی بھیجدیا ....

بیٹا دو مٹھی خاک اُٹھاؤ اور کنوئیں میں ڈال دو تمہارا ابھی ارمان نکل جائے ....
بیٹا تم اِس تمنّا میں تھے کہ اپنی مُنّی کو دُلہن بناؤ گے، لیکن، بیٹا پھر میں اکیلی ہوجاتی ....
تمہاری ننھّی مُنّی میرے کلیجے سے لگی ہوئی ہے۔ تین دن کلیجے سے لگی رہی اور کلیجے سے لگی چلی آئی
.... تین دن تک ہم تمہیں یاد کرتے رہے اور دعا کرتے رہے کہ کہیں تم نہ آجاؤ — تم
آجاتے تو مرنا بھی دوبھر ہوجاتا۔ اب تم آگئے تو جی چاہتا ہے پھٹے ہوئے سینے اور کٹی ہوئی گردن
کے ساتھ اُٹھ کر تمہیں سینے سے لگا لوں، لیکن یہ آداب فنا کے خلاف ہے .... جاؤ بیٹا
میں تم سے دُور نہیں رہوں گی۔ زندگی میں جتنا قریب تھی مر کر اس سے قریب تر ہوگئی ہوں......
میں تمہارے خیالوں میں رہوں گی نگاہوں میں رہوں گی۔ میرے خیال، میری یاد سے تمہارے
دل کی بھٹی گرم رہے گی، تمہارے آنکھیں سیراب رہیں گی، تمہاری زبان خوش گفتار رہے گی۔
.... تم کم سخن تھے اب سخنور ہوجاؤ گے۔ میں تمہاری زبان سے بولوں گی، تم اپنے
الفاظ میں میری آواز سُن لینا، میں تمہارے اشعار میں اپنی پکار سُن لوں گی .... اگر میں
تمہارے سامنے مرجاتی اور تم مجھے دفن کردیتے تو تمہاری محبت کا بڑا حصہ دفن ہوجاتا .... لیکن
میں تمہارے دل کے اندر زندہ ہوں ...... تمہارے جذبات میں ایک لامحدود خزانہ بن کر چھپ
گئی ہوں .... تم اِس خزانے سے ڈھیر کے ڈھیر لٹاتے رہو گے اور میں اضافہ کرتی رہوں گی
.... میری خاک اِس کنوئیں میں تمہاری آواز سنتی رہے گی، تمہارے نالۂ نیم شبی اور

آہِ صُبحگاہی سے میری خاک نم رہے گی۔ تم یہ کہو گے :

دردمندِ عشق ہیں غم سے نہ گھبرائینگے ہم
شاعری کرتے رہیں گے اور مرجائینگے ہم

اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائینگے ہم

لوگ اِن الفاظ پر جھومینگے اور میں اور میرے ساتھ یہ پوری انجمن ان رسمی الفاظ کے درپردہ حقیقت پر جھومتی رہے گی۔ اصل محفل تمہاری یہ ہے، اصل اہلِ ذوق، اصل مشتاقِ کلام، اصل سخن فہم اور اصل معنی شناس تو ہم ہوں گے، جو تم سے دُور رہ کر بھی بہت قریب ہونگے۔ .... جو لوگ تم سے قریب رہکر بھی دُور ہوں گے اُن کو تو تم یوں کہو گے :

کس کے دل پر کیا بیتی ہے کب سمجھے کب جانے لوگ
گھر بیٹھے سر دُھن لیتے ہیں سُن سُن کر افسانے لوگ

کوئی دیوانہ کہتا ہے کوئی شاعر کہتا ہے
اپنی اپنی بول رہے ہم کو بے پہچانے لوگ

اچھا بیٹا اب تم جاؤ، میں تلاوت کر رہی ہوں ...."

"سُن لیا کلیم! دیکھ لیا کلیم!! ..... تم مجھے سنگی سمجھ رہے تھے ....

مجھے بے جان پتھر سمجھ رہے تھے ۔ اِس پتھر کی کرامت دیکھی ؟ .... تم کیا جانو تین دن تک میری پتھر کی دیواروں میں کیسی آگ لگ رہی تھی .... میرے عاشقانِ جانباز ٹھنڈے ہو رہے تھے اور میں سُلگتی چلی جاتی تھی ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کہ انہوں نے اپنے لہو سے میری دیواروں کو ٹھنڈا کیا اور اپنی اکھڑی اکھڑی سانسوں سے ہوا دے دے کر ہر طرف سے چنگاریاں سمیٹ کر میرے سینے میں جمع کر دیں ۔ میں اُوپر سے ٹھنڈی ہوں مگر میرے سینے میں جوالا مکھی ہے .... اچھا اب تم جاؤ اور ان گڈوں کو دُودھ سے بھرے برتن اور شکر لے جاؤ ۔ اُن کے پاس لے جاؤ جنہیں ابھی گناہوں کی بھری بوریاں سمیٹنے اور جمع کرنے کو زندہ رہنا ہے ....“



میں تاریخ کا طالب العلم نہیں ہوں ، المناک حادثے اس سرزمین پر نہ جانے کتنے آئے ہوں گے ، کتابوں میں پڑھنا اور بات ہے موجِ خون کا خود سر سے گذار دینا اور بات ۔ مجھے اُس دن کے بعد پھر کچھ اس قسم کا احساس ہونے لگا کہ اس سے زیادہ المناک حادثہ نہ پہلے کبھی آیا ، نہ اب آسکتا ہے ۔ فوری کیفیت تو مجھ پر ایک حد تک خود فراموشی کی تھی ۔ زندگی کے

تقاضے تو رُکتے نہیں، معمولات اپنے حال پر قائم ہے، لیکن میں ایک مشین کی طرح ان معمولات سے گذرتا رہا۔ نہ کسی غم سے غم نہ کسی خوشی سے خوشی۔ میں خود اپنی زندگی کے حالات کا تجزیہ کرتا ہوں تو تین طرح کی کیفیات بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ میرے احساس کی دُنیا ایک آبلے کی شکل اختیار کر گئی، ذراسی ٹھیس سے یہ آبلہ پھوٹ بہتا۔ دُوسرے مجھے دُنیا میں کسی خطرے کا خوف باقی نہ رہا۔ میرے اِرد گِرد کوئی اور ہی فضا تھی۔ ہر شخص مستقبل سے ہراساں اور اسے ہر ممکن کوشش سے محفوظ بنانے کا ساعی اور آرزومند۔ چاہے محفوظ مستقبل کسی طرح حاصل ہو۔ گھر چھوٹتا ہو، وطن چھوٹتا ہو، اپنے پرائے چھوٹ جائیں مگر آیندہ زندگی ہر اعتبار سے محفوظ اور روشن ہو جائے ——— اور میں اپنے مستقبل سے بالکل مطمئن ——— !

ایسا معلوم ہو جیسے میرا کوئی مستقبل ہے ہی نہیں۔ میری زندگی میں دو ہی زمانے ہیں۔ میرا ماضی جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز، محبوب، حسین اور لذیذ ہے جس کی تمام تلخیاں شیرینی بن گئی ہیں۔ میرا ماضی ایک ایسی شراب ہے جس کے سُرور کو کسی ترشی کا خوف نہیں۔ یہ ایک سُرورِ جاوداں ہے اس کی مستی اور سرشاری مجھ سے کبھی الگ نہیں ہوتی۔ دوسرا میرا حال جس میں ساری رنگینی رعنائی دلفریبی اور دلکشی لذت اور چاشنی میرے ماضی کے تعلق سے ہے۔ بس اس کے آگے کچھ نہیں۔ تیسری چیز جو میری زندگی میں پیدا ہوئی وہ ایک بے پایاں محبت، ایک اتھاہ پیار اِس کائنات میں سانس لینے والی ہر مخلوق سے۔ میں کسی کے چہرے کی افسردگی،

کسی کی آنکھوں کے آنسو، کسی کی زلفوں کی برہمی، کسی کے ماتھے کی شکن، کسی کی چال کی خستگی، کسی کے حال کی آشفتگی سکون سے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے احساس کے سمندر میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔

میں نے میٹرک بہت اونچے درجے میں پاس کیا تھا۔ لیکن آیندہ تعلیم کا کوئی میلان ہی مجھ میں نہ رہا۔ تمام سہارے ختم ہو گئے، سوائے ایک چھوٹے بھائی کے جو خوش قسمتی سے میرے ہی ساتھ پٹنہ میں تھا میرا کوئی اور اپنا رہا نہیں۔ برادری اور قرابت والے سب ترکِ وطن کر گئے۔ میری چھوٹی سی دوکان رزق کا وسیلہ ہو گئی۔ سال ہی دو سال بعد رشتہ مندوں، قرابت داروں، دوستوں اور واقف کاروں کے تقاضے پڑوسی ملک سے بظاہر بڑے دلنشیں اور دلکش انداز میں آنے لگے۔ شاندار مستقبل اور خوش آہنگ زندگی کی تصویروں پر تصویریں بھیجی جانے لگیں۔ بڑے بڑے عہد و پیمان، اُونچے اُونچے وعدوں، لمبی لمبی اُمیدوں کے حسین اور دل آویز خواب برسائے جانے لگے۔ مگر میں جن چنگاریوں سے لپٹا ہوا تھا، جس خاکستر پر پڑا ہوا تھا، جن کانٹوں کو اوڑھ رکھا تھا انکے مقابلے میں کسی جنّتِ ارضی کی میری نگاہ میں کوئی قیمت، کوئی لذت باقی ہی نہیں تھی۔ میری جنّت برباد ہو گئی تھی مگر وہ برباد شدہ جنّت میرے تصوّر میں اپنے پورے شباب اور بھرپور حُسن کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اُس شیریں جنّتِ تصور نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو فراموش کر دیا تھا۔ میری جنّت

مجھ سے تیس میل دُور ویرانے میں لہلہا رہی ہے۔ میں جب کبھی میل یا ایکسپریس ٹرین سے کلکتہ یا اور کسی مقام کو جاتے ہوئے اپنے اس اسٹیشن سے گذرنے والا ہوتا جہاں سے میرے گاؤں کو مارٹن کمپنی کی چھوٹی لائن اب بھی جاتی ہے، تو کچھ دُور ہی سے میں سر اور آنکھوں پر کپڑا لپیٹ کر اپنی سیٹ پر پڑ جاتا اور زور سے برتھ کی لکڑی کو تھام لیتا۔ مجھے ڈر ہوتا کہ اگر چلتی ہوئی ٹرین کی کھڑکی سے فتوحہ چھوٹی لائن کے اسٹیشن کو اور ٹرین کو دیکھ لونگا تو ٹرین سے کود جاؤں گا ــــــ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک میں نے سفر کرتے ہوئے کبھی اس طرف رُخ بھی نہیں کیا ــــــ مجھے ڈر تھا کہ اس ویرانے پر جو اب تک میرے تصور میں لہلہاتا ہوا گلزار ہے، میری نظر نہ پڑ جائے اور میرے خوابوں کا محل مسمار نہ ہو جائے ــــــ! لیکن ۱۹۵۸ء میں گیارہ سال بعد ایک دن آیا اور میں نے ارادہ کیا کہ :-

اب کے اس برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں
آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائیں گے ہم

اور اُس دن میں فقیروں کی سی ایک جھولی گلے میں ڈالے اُس بستی میں پھر پہونچ گیا۔ ع

دُور تک جس میں کہیں سایۂ دیوار نہیں

جب میں اسٹیشن سے بستی کی طرف جا رہا تھا تو وہ سڑک، جو پہلے کچّی مٹی کی تھی، کولتار کی پختہ شاہ راہ بن گئی تھی، ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی فاقہ کش کے لبوں پر گھی لگا ہو یا کسی قحبہ پیرزال نے

سُرخیٔ غازہ کے پردے میں اپنے چہرے کی نفرت انگیز جھریوں کو چھپایا ہو۔ اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ کسی بیدرد محبوب کی گلی کو مرنے والے جانبازوں نے اپنی خاک سے پاک کر دیا ہو ؎

ستارے بن کے میری خاک کے ذرّے چمکتے ہیں
زمیں اُن کی گلی کی آسماں معلوم ہوتی ہے

اور یہ تصوّر دیر پا ثابت ہوا۔ اور مجھے اینٹ پتھر سیمنٹ اور کولتار کے اس ریختہ سے خون، ہڈیاں، آنسو، آنکھیں جھانکتی نظر آئیں اور میں سڑک سے کنارے کنارے کچّی زمین پر چلنے لگا اور بے اختیار جی چاہنے لگا کہ پاؤں سے چلنے کے بجائے آنکھوں اور ہونٹوں سے راستہ طے کروں۔ ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

بستی کے لوگوں نے مجھے کم عُمری میں دیکھا تھا۔ جوان ہو کر گیارہ بارہ سال بعد جب داخل ہوا تو اکثر لوگوں نے کوئی اجنبی سیّاح و مُسافر سمجھا۔ جب میں اپنے گھر کے قریب پہونچا جس کا کچھ حصّہ خاکستر ہونے سے بچ گیا تھا اور جس میں اُسی وقت سے پولیس چوکی قائم ہو گئی ہے، تو ایسا معلوم ہوا جیسے برسوں سے جس زخم پر انگارا رکھا ہوا تھا اس پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔ میں بے اختیار صحن کے گھاس پر پڑ گیا اور اپنی چھاتی زمین سے لگا دی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ساری کائنات کا سکون، ٹھنڈک اور خوشبُو میرے سینے میں داخل ہو کر دل سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

ایسا معلوم ہوا جیسے میری ماں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ برسوں کی تشنگی، برسوں کی تڑپ، برسوں کی جلن، یک بیک سیرابی، آسودگی اور سکون میں تبدیل ہو گئی ______ کرایہ دار پولس چوکی کے کانسٹبل، حولدار اور تھانے دار میرے قریب جمع ہو گئے۔ اور میری حالت سے متحیّر کھڑے ہو گئے۔ میں نے جب گھاس سے اُٹھ کر یہ بتایا کہ میرا ہی نام کلیم ہے اور وہ میرے ہی کرایہ دار ہیں، پھر دس گیارہ سال پہلے کی کہانی انہیں معلوم ہو گئی۔ تھانے کا پورا اسٹاف بڑی محبت اور عقیدت سے پیش آیا اور آناً فاناً پوری بستی میں بجلی کی طرح بات دوڑ گئی کہ گیارہ سال بعد اس گاؤں میں ایک مسلمان آیا ہے اور اِسی گاؤں کا ہے اور کوئی دوسرا نہیں کلیم آیا ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے میرے نزدیک بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور بچوں، بچیوں کا ہجوم ہو گیا ______

ہرنام سنگھ بزاز، نرائن ساؤ تیلی، سدھو سنار، جھابیر حلوائی، ماسٹر رمیش، شیو نندن حجام، سومر دو سادھ، انتو چمار، پرشادی سنار، منشی گوپال پرشاد پٹواری، گجادھر پانڈے اور بھتو پاسی کی بیوہ اور سرجی تمبولن اور پرشادی سُنار کی بیٹیاں جو میری پڑوسن تھیں، جن کے ساتھ میں کھیلا کرتا تھا۔ اور نہ جانے کون کون کتنے نئے لڑکے، کتنی نئی لڑکیاں اور رام کھلاون پرشاد کی بیوی جسے میں بھابھی کہا کرتا تھا، جوان لڑکیاں اور عورتیں گھونگھٹ ڈالے ایک آنکھ گھونگھٹ کے گوشے سے نکالے، کسی کی آنکھ ڈبڈبائی ہوئی، کسی کے ہونٹ پر ہلکا سا تبسّم، کسی کے چہرے پر حیرت و استعجاب .... اِین؟ کلیم ایلن ہیں؟ (کلیم آئے ہیں؟) .... کلیم بابو ہتھن؟ (کلیم بابو ہیں؟)

...... کلیم؟ .... کلیم .... "کتھن (کہاں) ہیں کلیم؟" .... سُرجی تمبولن ستر برس کی عمر دیکھنے میں پچاس سے بھی کم، گوری چٹی پست قد، بھیڑ کو چیرتی ہوئی بڑھ رہی ہے "کتھن ہیں کلیم؟" .... "اِدھر ہیں ہم سُرجی!" .... "او ہو کلیم ہو؟ .... ہائے بیٹیا .... کیا ہو گیا بیٹیا؟ .... یہ کیا ہو گیا بیٹیا؟ .... سُرجی تو تمری ماں کے ساتھ ہی مر گئی بیٹیا .... اب بستی میں تو کچھ نا ہے بیٹیا ...... بستی تو ختم ہو گیلی بیٹیا"... .... بھتو پاسی کی بوڑھیا جورو .... کُبڑی جھکی جھکی آئی اور دور سے میری بلائیں لیتی ہوئی بولی ——— "ہائے اُمّتو جی (میری ماں اُمّت الفاطمہ) .... کوڑھیین کے ہاتھو نہ پھوٹل .... بٹیا توں کہاں ہے بیٹا؟" .... "ہم تو پٹنہ میں ہیں میّا!" .... "اور نسیم کہاں ہے؟" ..... "وہ بھی میرے ساتھ پٹنہ میں ہے" .... "دُکھ سُکھ گُجر گیلی بیٹیا .... توں آجا بیٹیا۔ ہییں (یہیں) رہ بیٹیا" .... "میرا بھی یہی جی چاہے ہے، دیکھو" .... اور رام کھلاون کی ادھیڑ بیوی گھونگھٹ میں سے مسکراتی ہوئی بولی .... "ہمرا چینھا کلیم؟ (ہم کو پہچانا تو ہو کلیم)" .... "ہاں تم کو پہچانتے ہیں بھابھی" .... "کب اے وا کلیم؟ (کب آ گئے کلیم)" .... "دیکھو کیا کہیں" .... "اور ہم کو پہچانتے ہو کلیم"؟ پرشادی سُنار کی جوان بیٹیاں .... میری ہم دیوار تھیں، میرے یہاں سے آنا جانا ...... کبھی دیوار میں دروازہ نکال دیا جاتا اور شادیات میں دونوں گھر ایک ہو جاتے۔ میں بچپن میں اکثر

ان کے ساتھ کھیلا کرتا ...... سیانی ہوئیں تو یہ بھی پردے میں رہنے لگی تھیں۔ کبھی کبھار سلام پرنام ہو جایا کرتا تھا۔ اب بالکل جوان تھیں .... بستی سے ایک تہذیب کے مستقل ختم ہو جانے کی وجہ سے پردہ داری اس درجہ پر نہ تھی۔ گھونگھٹ نکالے دو تین لڑکیاں کھڑی تھیں.... .... "ہم کو پہچانتے ہو کلیم"؟ .... میل جول کی وجہ کر ان کی زبان صاف تھی..... "نہیں ہم تو نہیں پہچان رہے ہیں"........ "ارے کلیم! ہم پرشادی سُنار کی بیٹی ہیں نا!"....... "اچھا ہیرا رانی! سونا رانی!! روپا رانی!!!" ——— "ہاں .... ہاں .... ہاں ....." تینوں کی آنکھوں میں آنسو اور تینوں کی لبوں پر مُسکراہٹ۔ غم اور خوشی کا میل ....

آنکھ میں آنسو تبسم لب پہ تھا احباب کے
جب خوشی کی لَے میں غم کی راگنی گائی گئی

اور رام پرشاد مالی کا جوان بیٹا پہلوان کشتی گیر، جس کے ساتھ میں کبھی کبھی زور کیا کرتا تھا اور جس کے امرود کے باغ سے آدھ آدھ سیر شیریں امرود سعیدی اور شہیدی ایک ایک وقت کھا جاتا اور کھا کر دو دو روز بخار میں مبتلا رہتا۔ اور جو پھولوں کے گجرے اور ہار بنا کر لاتا اور میں کلائی میں گجرے باندھ کر اور گلے میں ہار ڈال کر اپنے مکان کے سامنے حضرت امام حسینؑ کے امام باڑے کے چبوترے پر شان سے بیٹھا کرتا .... دوڑا دوڑا گیا اور چند منٹ میں رلے ملے پھولوں کا ایک ہار بنا کر لایا۔ "آج ہمرا ہاتھ سے ہار پہن لا کلیم بابو"! ——— "ضرور پہنیں گے رام کشن!

لاؤ گلے میں ڈال دو"............ گلے میں ہار ڈال دیا اور شدھو سنار جو مجھ سے رتن میں کچھ چھوٹا تھا، ناٹک اور ڈرامے کا بڑا شوقین...... ناٹک پارٹی اس نے بنائی تھی۔ ہارمونیم بجاتا تھا۔ میں جب اسکول سے چھٹیوں میں گھر آتا تو کچھ ناٹک کے سوانگ کے تماشے دکھاتا اور میں نے کچھ سوانگ کے کپڑے بھی لاکر دیئے تھے، جسے پہن کر جھوم جھوم کر آلہا اور اُودل کے گیت گاتا............

ادھر ہار میرے گلے میں رام کشن نے ڈالا اور شدھو نے زور سے نعرہ لگایا "کلیم بھیا کی جے" اور سارے، بچوں اور بچیوں نے اور جوان لڑکوں اور لڑکیوں نے زور سے جے کہا ——————

اور پولیس کے سب انسپکٹر جو میرے مکان میں کرایہ دار تھے، نام مجھے یاد نہیں جوان آدمی تھے، تمتمائے ہوئے چہرہ کے ساتھ میری بغل میں کھڑے ہوگئے .... "کلیم صاحب! اور بھائیو اور بہنو!! میں نے آج تک پریم بھاؤ محبت کا یہ درشن نہیں دیکھا تھا........ آج ایسا ہو رہا ہے تو کل ویسا کیوں ہوا؟ ...." اور کیا کیا بولے مجھے یاد نہیں۔ میں تو بیٹھ گیا ——— میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ماسٹر رمیش جو مقامی ہائی اسکول میں ٹیچر تھے، بوڑھے ہو رہے تھے بول اُٹھے ———

"کیوں ہوا؟ یہ نہ پوچھئے داروغہ جی۔ وہ تو ہونی تھی ہوئی .... یہ پوچھئے کس نے کیا .... میں جانتا ہوں داروغہ جی کس نے کیا، آپ نہیں جانتے .... آج بھی وہ آپ کے قریب ہیں اور ہمارے قریب ہیں، ہم ہی میں ہیں .... یہاں پر نہیں ہیں لیکن یہیں ہیں

.... انہوں نے اپنے جیسوں کو جمع کیا۔ ان کے جیسے بہت رل جاتے ہیں ——— اور بہت رل جاتے ہیں ——— آج بھی ملتے ہیں اور ملتے رہیں گے ——— لیکن جیسے لوگ یہاں ابھی جمع ہیں، ایسے بہت کم ہیں اور بہت کم ملتے ہیں ——— اور آگے اور بھی بہت کم ہوں گے ——— اور بہت کم ملیں گے ——— اور بڑی مشکل سے ملیں گے ——— اور کم ہوتے ہوتے پھر بالکل نہیں ملیں گے ——— اور پھر ——— ان چاند ستاروں کو کوئی دیکھنے والا نہیں رہے گا ——— اور پھر یہ چاند ستارے بھی نہیں ہوں گے .... بس رہے نام بھگوان کا ....''

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا ....

میری واپسی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ دار وغہ جی کے ہاتھ میں بیس پچیس روپے دیئے کہ مٹھائی منگائیے اور بچوں کو بانٹئے ——— مٹھائی آئی، بچے اور بچیاں بڑی خوشی اور مسرت سے مٹھائی لینے لگیں۔

اس کے بعد میں آنے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ رام کھلاون کی بیوی اور سونا رانی

ڈو تھال لئے آ رہی ہیں .... "پانی پی لو کلیم جی !" ——— "ارے یہ کیا سونا رانی !
یہ پانی پلانا ہے یا جان مارنا ہے ؟ یہ تھال بھر مٹھائی ؟ میں تو بیمار ہوں سونا رانی ! مجھ سے
تو نہیں کھایا جائے گا "
" ناکھیوا تو جبردستی ٹھونس کے کھلائیو (نہ کھاؤ گے تو زبردستی ٹھونس کر کھلائیں گے)"
رام کھلاون کی بیوی بولی ——— مختصر یہ کہ وہ بھی ایک منظر تھا — !

میں واپس چلا آیا۔ اور اُس سال کے بعد تقریباً ہر سال اپنے دل کی بیٹری چارج
کرنے کو ایک بار ضرور جاتا ہوں۔ پوری بستی کا طواف کر لیتا ہوں۔ جتنے گنج شہیداں ہیں فاتحہ
پڑھ لیتا ہوں اور سال بھر کے لئے آنسوؤں کا خزانہ جمع کر کے لے آتا ہوں۔



۴۷-۱۹۴۶ء کا انقلاب کوئی نیا انقلاب نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی اس سے چھوٹے بڑے بہت انقلابات آئے۔ ان کا ذکر تاریخوں میں ہے، کتابوں میں ہے۔ تقریروں میں ہے، تحریروں میں ہے، ادب اور شاعری میں ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ پہلے اس کا ٹھکانا زندگیوں میں بنا اور ان زندگیوں سے ادب اور شاعری میں منتقل ہوا۔ ایسی زندگیاں کم ہوتی ہیں، لیکن ہوتی ہیں۔ یہ کوئی عجوبہ چیز نہیں ہے۔ یہ قدرت کا ایک نظام ہے۔ یہ آئینِ فطرت ہے۔ ادب و شاعری آئینِ فطرت کے ماتحت ہیں۔ الگ نہیں ہیں۔ اس کائنات کے تمام خزانوں کو انسان کی زندگی ہی میں چھپایا گیا ہے۔ اسی خون سے سب کچھ برآمد ہوتا ہے، اسی سرچشمے سے سب کچھ نکلتا ہے۔ اس کائنات کی ساری روشنیاں اور تاریکیاں پہلے زندگی میں منتقل ہوتی ہیں، پھر وہاں سے شکل و صورت بدل کر ادب و شاعری کے بھیس میں سامنے آتی ہیں۔ اس انقلاب کا ایک مستقل ٹھکانا میری زندگی بھی بنا۔ ایک ایسی زندگی میں بھی ہوں۔ جب میں نے پہلے کبھی کہا تھا :

مرے سُننے والے مجھے دیکھتے ہیں
میں بے پردہ نکلا نقابِ سخن میں

اور اپنے ہی آئینۂ شعر میں اپنی دھندلی دھندلی پرچھائیں دیکھ کر میں خود بھی کم اچنبھے میں نہیں آیا۔ جیسے جیسے اس پرچھائیں سے اُنس بڑھتا گیا اپنے کو اور زیادہ صاف اور واضح دیکھنے کی تمنا بڑھتی گئی۔ پرچھائیں صاف ہوتی گئی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرے لئے دُکھ بھری تنہائی

سوہانِ رُوح تھی۔ میرے ہی الفاظ کے پردوں پر میری شبیہہ کا دُھندلا دھندلا عکس جب مجھے نظر آیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس اندھیرے میں اس تنہائی میں کوئی میری بغل میں آکر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنی ہی آواز میں ایک ہم نشیں، ایک ہم نوا، ایک ہمراز مل گیا۔ اور میں اپنے ہمراز، اپنے ہم نوا سے زیادہ سے زیادہ بے تکلف رہنے کے لئے بیقرار رہنے لگا۔ اور یہ بیقراری میرے فن سے گرد و غبار دُور کرنے لگی۔ اور پرچھائیں کے خط و خال آہستہ آہستہ نمایاں ہونے لگے ______

اور اب سچ کہتا ہوں کہ جب میں انجمن میں رہتا ہوں، بازاروں میں گھومتا ہوں، مشاغل میں گھرا رہتا ہوں تو اپنے ہمنشیں سے ملنے کے لئے بیتاب رہتا ہوں۔ اس تلاش میں رہتا ہوں کہ کوئی گوشہ میسّر ہو، کیسی بھی ہو کوئی خلوت میسّر ہو۔ گھر ہی میں کوئی تنہائی کی جگہ، ٹرین کے سفر میں اپنا برتھ، کلاس میں کوئی خالی Period، کچھ نہیں تو رکشہ یا ٹرین پر چلتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اپنے لئے خلوت حاصل کر لیتا ہوں۔ اور پھر اپنے ہم نشیں کو آواز دیتا ہوں :

زمانے کو نیند آرہی ہے جگاؤ   کلیم آؤ کوئی غزل گنگناؤ

وہ ستم نہ ڈھائے تو کیا کرے اُسے کیا خبر کہ وفا ہے کیا
تو اُسی کو پیار کرے ہے کیوں یہ کلیم تجھ کو ہوا ہے کیا

شعر و غزل میں ڈوبی ہوئی رات ہے میاں
تم کیوں **کلیم** روٹھے ہو کیا بات ہے میاں

پھر سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں مل کر کبھی روتے ہیں، کبھی مُسکراتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر قوت، زندگی، توانائی اور حوصلہ کا ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔ مجھ سے میرے فن میں توانائی ہے اور میرے فن سے مجھ میں قوت ہے۔ میری عُمر پچاس کو پہونچ رہی ہے، میری غذا بہت مختصر ہے جسے بعض لوگ غذا نہ ہونے کے برابر کہتے ہیں۔ میرا جسم ہمیشہ مشقت میں رہتا ہے۔ میں بہت کم سوتا ہوں۔ میرا اضطراب ہمیشہ گھلائے رہتا ہے۔ میرا بدن لاغر ہے۔ لیکن میری عمر کے چند ہی لوگ نکلیں گے جو قوت میں، حوصلہ میں، عزم میں، ارادے میں، تحمل میں، برداشت میں، مشقت میں، ہمّت میں مجھ سے قریب ہو سکیں گے۔ میری شاعری کی غمگینی، الم آفرینی، اس میں لہجہ کا جو دھیما پن ہے، اس میں جو نازک نازک سے آبگینے کی گھلنے کی کیفیت ہے، اس میں جو نرم نرم سے پھولوں کے پھوٹنے کا آہنگ ہے، اس میں جو زخموں کے رِسنے کی سی سرسراہٹ ہے۔ یہ مریضانہ پن نہیں ہے۔ ان میں وہ صحت مندی ہے، ان میں جینے کا اور جلانے کا وہ حوصلہ ہے جو مجھے بڑی سے بڑی للکار والی شاعری میں بھی نظر نہیں آتی ——— اگر یہ میرا بڑا بول ہے تو مجھے معاف کر دیا جائے۔

میں نے شاید پہلے بھی عرض کیا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، اس شاعری کو فن کی حیثیت سے

میں نے کبھی اختیار نہ کیا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں کسی دَور میں بھی یہ بات نہ آئی کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے دوسروں کے سامنے فنِ شاعری کی حیثیت سے مجھے پیش کرنا ہے۔ اسے تُلوانا ہے، پرکھوانا ہے، کسوٹی پر کسوانا ہے، اس کی قدر و قیمت لگوانا ہے، اس کا بھاؤ پوچھنا ہے۔ یہ چیز کبھی جنس کی حیثیت سے بازار میں جائے گی یہ شان و گمان میں نہ تھا۔ جیسا میں نے عرض کیا کہ برسوں کی تلاش اور نامعلوم اور نامحسوس سی جُستجُو نے ایک شکل اختیار کی، مجھے ایک ہمدم و ہمراز دیا۔ میری غزل کا میرے لئے اصل اور حقیقی موضوع یہی ہے۔ غزلیں کہنے والا کلیم غزلوں میں چھپے ہوئے کلیم سے باتیں کرتا ہے۔ دو جگری دوستوں میں بلا تکلف اور بلا تصنّع گفتگو، وہ بات جو کسی سے نہ کہی جا سکتی ہو۔ وہ گفتگو جس میں دِلوں کا راز ہو۔ سیدھی اور سادی۔ صُبح کی بات شام دُہرائی جاتی ہے۔ شام کی بات صُبح کو سُنائی جاتی ہے۔ سُنو کلیم! آج یہ بات ہوئی، آج کا یہ قصّہ ہے، دیکھو یہ آج کی کہانی ہے۔ ہر بات نئی ہے، ہر قصّہ تازہ ہے۔ ہر کہانی انوکھی ہے، ہر سرگذشت نرالی ہے۔ روز کی باتیں ہیں۔ صبح و شام کی حکایتیں ہیں۔ دوسروں کو جو رازدار درُونِ میکدہ نہیں ہیں پُرانی باتیں، فرسُودہ باتیں، پامال باتیں نظر آتی ہوں، لیکن دونوں کلیم کے مابین کہی اور سُنی ہوئی باتیں ہر صبح کی کرن کی طرح نئی اور ہر شام کی شفق کی طرح تازہ ہیں۔ زندگی کبھی پُرانی نہیں ہوتی۔ ہر گام نیا طُور، نئی برقِ تجلّی اور شعر میں، ہر گام کے نئے طور اور نئی برقِ تجلّی کی آب و تاب ہے۔ اس شاعری میں تجربے مستعار نہیں ہیں

برائے بیت نہیں ہیں، نئی زندگی کے نئے تجربے ہیں۔ روزانہ کے تجربوں کو نئی دُلہن کی طرح ان حسین نرم ونازک ملبوسات سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ ان کسوٹی پر پرکھے ہوئے جانچے ہوئے مانے ہوئے زیورات سے سجایا جاتا ہے۔ ان موتیوں سے، ان جواہرات سے، ان لعل وگہر سے سنوارا بنایا جاتا ہے جن کی رنگینی اور رعنائی، قدر وقیمت، آب وتاب، حُسن اور تازگی ہمیشہ کے لئے تسلیم کر لی گئی ہے۔ حسن ان ملبوسات، ان زیورات، ان جواہرات کے سلیقۂ استعمال میں ہے۔

میں اپنے شعر میں اپنے تجربات، اپنے محسوسات کو پہلے اپنے دل کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کہنے والا کلیم سُننے والے کلیم سے مخاطب ہوتا ہے۔ دونوں میں بحثیں ہوتی ہیں، حُجّتیں ہوتی ہیں، جھگڑے ہوتے ہیں۔ جب تک حُجّتیں، بحثیں، جھگڑے ہوتے رہتے ہیں دونوں کی پیشانیوں پر شکنیں رہتی ہیں، تیور پر بل رہتے ہیں، ابرُوؤں میں کجی رہتی ہے لیکن یک بیک ایک مقام آتا ہے جہاں یہ سب ختم ہو جاتے۔ ایک مقام پر آکر دونوں ہم خیال، ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ پھر شکنیں دُور ہو جاتی ہیں، بل نکل جاتے ہیں۔ کجی ختم ہو جاتی ہے، دونوں کے چہرے کھل اُٹھتے ہیں۔ پھر دونوں ہم آواز ہو کر گنگنانے لگتے ہیں، جھومنے لگتے ہیں۔ جب تک یہ سب ہو نہیں لیتا، شعر نہیں ہوتا۔ کبھی یہ مقام بہت جلد آتا ہے کبھی دیر میں آتا ہے ——— کبھی بہت دیر میں آتا ہے ——— کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ دونوں کے جھگڑوں نے میری نماز بھی خراب کر دی۔

کھانے کا مزہ کرکرا کر دیا۔ نہ کھانے کے وقت دونوں کی بحثیں رُکتی ہیں، نہ چلنے پھرنے کے وقت، نہ خلوت میں نہ انجمن میں۔ مسجد میں نہ میکدہ میں۔ نہ ان کے جھگڑے کے لئے کوئی جگہ کی شرط ہے نہ ان کے ملنے کے لئے کسی مقام کی قید۔ میں نے قلم لے کر کبھی شاعری نہ کی۔ سیماب اکبرآبادی کی طرح کھانا کھاکر، حقہ لے کر، ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر فکر شعر کبھی نہ کیا۔ کسی حادثے نے، کسی تجربے نے، کسی خیال نے، کسی یاد نے دل کے تاروں کو چھیڑا اور کام شروع ہو گیا ——— جب کارخانہ چل پڑا تو پھر کبھی نہیں رُکتا۔ کبھی ایسا ہوا کہ تین چار شعر پے در پے چلتے پھرتے ہو گئے۔ کبھی ایک مصرع آیا اور دوسرا مصرع گھنٹوں گذر گئے، دن گذر گئے پتہ ہی نہیں جس طرح کوئی بازیگر ایک برتن میں مختلف سنگریزے شیشے کے ٹکڑے رکھ کر بجاتا ہے۔ الفاظ، تجربہ، خیال، جذبات آپس میں گڈمڈ ہو کر بجتے رہتے ہیں۔ ان کی کوئی متعین آواز نہیں ہوتی، بس ایک جھمیلا ہوتا ہے۔ اچانک ایک آواز یکسو ہو جاتی ہے۔ ایک خاص آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور مصرع یا شعر مکمل ہو جاتا ہے ——— کبھی ایسا بھی ہوتا ہے — ایک خاص آہنگ، ایک خاص آواز پیدا ہو جانے کے بعد بھی کچھ نامحسوس قسم کی کمی کا احساس رہتا ہے۔ اسوقت مختلف الفاظ کے ملے ہوئے ٹکڑوں پر فکر کی قینچی چلتی رہتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ٹکڑا، ایک لفظ، ایک جملہ ٹھیک بیٹھ گیا۔

میری شاعری کی دُنیا میں الفاظ کے علاوہ کوئی چیز مستعار نہیں۔ میں بیس[۲۰] برس

پہلے تک مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اب مطالعہ بھی نہیں کرتا۔ زندگی تجربات، حادثات کا سلسلہ ہوتی ہے۔ میں زندگی پر گہری نگاہ رکھتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے کہ پچیس[۲۵] سال پہلے ایک حادثے نے دل کا رُخ موڑ دیا، اب دل اسی راہ پر ناک کی سیدھ پر چلا جا رہا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اس حادثے نے مجھے چلنا سکھایا، ایک سلیقۂ رفتار دیا۔ مستقل طور پر قدم اُٹھانے کا ایک ڈھنگ دیا۔ رفتار کا یہ سلیقہ، چلنے کا یہ ڈھنگ میرا اپنا ہے، جس میں میرا کوئی شریک نہیں، نہ میں کسی کو شریک سمجھتا ہوں۔ میر کو بھی چلنے کا ایک ڈھنگ ملا۔ ایک اندازِ رفتار ملا۔ اس رفتار سے وہ ۸۰، ۹۰ سال کی زندگی میں نہ جانے کتنے نئے راستوں پر چلے۔ کتنی شاہراہیں، کتنی پگڈنڈیاں ان کے قدموں کے نیچے آئیں۔ مگر وہ ہر شاہراہ پر، ہر راستے پر، ہر پگڈنڈی پر، اپنی مخصوص رفتار سے چلتے رہے۔ اور ہر راہ ان کی رفتار کی گل تراشی سے رشکِ گلزار بنتی گئی۔ مجھے بھی چلنے کا ایک ٹوٹا پھوٹا ڈھنگ وقت نے بخشا۔ یہ چال میری اپنی ہے۔ میں روزانہ کتنے شاہراہوں پر چلتا ہوں۔ زندگی کی رواں دواں ندی تیزی سے گذر رہی ہے ــ اور کتنے نشیب و فراز سے اسے گذرنا اور اُبھرنا پڑتا ہے۔ کتنی چٹانوں سے اسے ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ کتنے موڑ سے اسے مُڑنا پڑتا ہے۔ مگر اس کی رفتار کی ایک خاص شان ہے جو نہیں بدلتی ــــ میری زندگی نو بنو، تازہ بتازہ تجربات اور محسوسات سے روزانہ گذرتی ہے ــــ انہیں اپنی آغوش میں سمیٹتی ہوئی اور اپنے سانچے میں ڈھالتی ہوئی آگے بڑھتی ہے :

گُل کاریوں سے باز نہ آئے جُنوں کی ہم
جس راہ پر چلے اسی رفتار سے چلے

مُدّت ہوئی اک حادثۂ دل کو پر اب بھی
پہونچے ہے وہیں بات جہاں سے بھی چلے ہے

بات ہر جگہ سے چلتی ہے، ہر روز چلتی ہے۔ ہر صبح چلتی ہے، ہر شام چلتی ہے۔ اس ہر جگہ، ہر روز ہر صبح اور ہر شام چلنے والی نئی نئی تازہ بتازہ باتوں کو اس سانچے میں ڈھال دینا، یہ میرے لئے بڑی مشقّت کا کام ہے۔ مگر برسوں کی چال نے اب یہ بات بڑی حد تک آسان کردی ہے۔

میں نے غزل کی قدیم اصطلاحوں کو، ترکیبوں کو، الفاظ کو دیکھا تو ان میں وقت کا ساتھ دینے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ میں نے ان پر نئی دُنیا کے نئے تجربات اور نئی زندگی کے نئے تقاضوں کا بوجھ رکھنا شروع کیا۔ پہلے پہل ان کے قدم ڈگمگائے، کبھی کبھی یہ گر بھی گئے۔ مگر آہستہ آہستہ ان میں نیا دم خم پیدا ہونے لگا۔ ان کے چہروں پر نئی تازگی اور نئی شگفتگی آنی شروع ہوئی۔ ان کے جسموں میں نئی لچک اور ان کی آنکھوں میں نئی معنویت بیدار ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ میری زندگی سے پورے طور ہم آہنگ ہوگئے۔ مجھے اس بات پر ضرور فخر ہے کہ برسوں کی مشق اور خونِ جگر چھڑکنے کے بعد میں نے غزل کی قدیم تکنیک اور اس کی قدیم اصطلاحات،

قدیم استعاروں میں جذبۂ زندگی کی نئی معنویت سموکر انہیں نئے زمانے کے ساتھ، پوری توانائی حسن اور تاثر کے ساتھ سفر کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ اب جب یہ بھرپور طریقے سے 'نئے' زمانے سے آشنا اور اس کے علَم بردار بن کر بڑھ رہی ہیں تو نئی زندگی کی بہت سی نئی آوازیں، نئی اصطلاحیں حیرت سے انہیں دیکھ رہی ہیں۔ اور ان کے چہروں پر کچھ غیرت اور کچھ ندامت کے پسینے آرہے ہیں۔ اور کچھ انہی کے جھنڈوں کے نیچے آکر ان کے قدم بہ قدم، شانہ بہ شانہ، چلنے کی کوشش اور اس کوشش میں کچھ کامیابی پر فخر کرنے لگی ہیں۔ یہ کوئی بڑا کارنامہ نہ ہو، لیکن بہر حال مجھے اپنی اس حقیر کوشش پر اطمینان اور سرور حاصل ہے۔ میں قدیم وضع داری کا رسیا ہوں۔ مجھے ان میں جو حُسن نظر آتا ہے کہیں نظر نہیں آتا۔ میرا یہ اعتماد ہے کہ وہ پس پُشت افتادہ قدریں بھرپور کشش تاثیر حُسن اور جمال کے ساتھ نمایاں ہوں گی۔ سوٹ، ٹائی، شرٹ اور پینٹ کے کھچا کھچ ماحول میں بھی میں نے آج تک کُرتہ، پاجامہ، شیروانی، ٹوپی کی وضع نہیں بدلی۔ کبھی سوٹ نہ پہنا، کبھی ٹائی نہ لگائی۔ درانحالیکہ اُردو کے ساتھ انگریزی زبان و ادب کا بھی برابر ساتھ رہا ہے اور الحمدللہ میں بہت سے مستقل سوٹ پہننے والوں اور ٹائی لگانے والوں سے اچھی انگریزی لکھ اور بول سکتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اپنی وضع کے حُسن اور اس کی کشش میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ بلکہ اس کے حُسن نے ہر حُسن کا چہرہ زرد کر دیا۔ میں جب پٹنہ یونیورسٹی شعبۂ اُردو میں آیا تو سبھوں نے مجھے وضع کی تبدیلی کا پُرزور مشورہ دیا۔ مگر الحمدللہ شیروانی،

سُوٹ سے تو نہ بدلی۔ کہیں کہیں سوٹ، شیروانی سے بدل گیا۔

مشاعروں سے دلچسپی بہت کم ہے اور بہت کم جاتا ہوں، مگر عوام سے اس کم آمیزی کے باوجود عوام و خواص میری رُوحِ غزل اور مزاجِ غزل سے آشنا اور ہم آہنگ ہو گئے ہیں ــــ جب میں ایسی غزل پڑھتا ہوں :

کس ناز کس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو

دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو

تو میرے سُننے والوں کا چہرہ غزل کے ظاہری چلتے پھرتے انداز کے باوجود بے حد سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ الفاظ اور اصطلاحات کے پردے ان کی نظروں کو نہیں روک سکتے۔ وہ نظریں پردے چاک کر کے دُور چھپی ہوئی اپنے قریب کی دُنیا کی مجسّم متحرک تصویریں دیکھنے لگتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے،

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

والی غزل پٹنہ ہی کے ایک مشاعرے میں پڑھتی تو پٹنہ ہی میں رہنے والے پٹنہ یونی ورسٹی ہی کے

ایک جواں اُستاد نے جو گرچہ مجھ سے عُمر میں جونیئر ہیں مگر ملازمت میں سنیئر ہیں، میری داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا " ہائے کلیم صاحب! کی بھی تو کس سے آشنائی کی " اور اپنی دانست میں یہ سمجھے کہ نہایت ہی برجستہ اور شاعرانہ بامحل فقرہ چُست کیا ہے۔ میں نے ان کی مُنڈی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا " برادرم! بہت جلد آپ سے بھی آشنائی ہوجانے والی ہے۔ آخر کب تک کھنچے رہوگے کب تک تنی رہے گی؟ " ——— اور کبھی ایسا ہوا کہ دہلی کلاتھ ملس کے شاندار مشاعرہ میں پچھلے سال یہ غزل پڑھتے ہوئے :

یہ رنگ اشکوں کا جو لال لال ہے پیارے
بتا رہا ہے کہ کیا دل کا حال ہے پیارے

جب یہ شعر پڑھا :

وہی تو عُمر مرے دردِ دل کی بھی ہوگی
ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے ؟

تو سب سے پیچھے عوامی درجے میں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اُٹھ کر زور سے چلاّ کر کہا ——— " حاجز صاحب یہ ستائیسواں سال ہے " .... اور میں نے جی میں کہا کہ کمی نہیں غالب .... فن کار اور فن شناس میں گہرا رابطہ ہے۔ مگر یہ رابطہ فن کو پست بھی کرتا ہے اور بلند بھی۔ یہ فن کو بگاڑتا بھی ہے اور سنوارتا بھی ہے۔ کہنے والا اگر سُننے والے کے ذوق

کا اندھا بن کر اتباع کرتا ہے تو فن کی سطح آہستہ آہستہ پست ہو جاتی ہے اس لئے کہ سننے والا ہمیشہ اس بات کا آرزو مند ہوتا ہے کہ اسے فکر نہ کرنی پڑے اور فکر سے ذوق پر جلا ہوتی ہے، ورنہ زنگ آلود ہوتے ہوتے بالکل کند ہو جاتا ہے۔ اور اگر فنکار سننے والوں کو اندھا سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے تو خود فن کار کی شاخِ فکر ناتراشیدہ ہوتی جاتی ہے۔ فنکار اور فن شناس دونوں ایک دوسرے کے ذوق کی تراش خراش کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے معلّم اور متعلّم ہیں۔ یہ رابطہ بڑا نازک ہے ـــــــ میں سننے والوں کے ذوق سے بے نیاز اور بے پرواہ نہیں رہا لیکن میں ان کی طرف کھنچا نہیں بلکہ انہیں اپنی طرف کھینچنے کی ہمیشہ کوشش جاری رکھی اور یہ کوشش کامیاب ہے۔ وہ اب آسانی سے سمجھنے لگے ہیں کہ میرے اشعار میں لفظوں کا ایک تو سطحی مفہوم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایک دوسرا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ وہ سمجھنے لگے کہ سادگی صفائی اور سہل ممتنع میں بھی تہداری اور گہرائی ہوتی ہے ـــــ وہ یہ ماننے پر مجبور ہوئے کہ قدامت میں بھی جدّت ہو سکتی ہے۔ وہ اعتراف کرنے لگے کہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا بدل بھی ہو سکتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا عکس، پرتو اور ترجمان بھی ہو سکتے ہیں۔ جن الفاظ سے انگرکھا، شیروانی اور مرزئی بن سکتی ہے، ان ہی الفاظ سے بُش شرٹ اور پتلون بھی بن سکتا ہے۔ یہ جھونپڑے کے خس و خاشاک بھی بن سکتے ہیں اور محلوں کے سنگ و خشت بھی۔ یہ چٹائی اور بوریہ بھی بن سکتے ہیں اور مخملی گدّے

اور اطلسی چادر بھی ۔ یہ جامِ سفال بھی بن سکتے ہیں اور جامِ جم بھی ۔ الفاظ زمان اور مکان کے پابند بھی ہیں اور زمان و مکان بھی الفاظ کے پابند بن سکتے ہیں ۔ وقت الفاظ کی طنابیں بھی کھینچ سکتا ہے اور الفاظ وقت کی طنابیں بھی کھینچ سکتے ہیں ۔

تم میرے فکر و فن کا اگر حوصلہ بڑھاؤ
دُنیا میں کھینچ لاؤں فضائے بہشت کو

یہ افہام و تفہیم بڑا دردِ سر ہے ۔ مگر دردِ سر ہی صندل بھی لگواتا ہے ۔ اس کاروبارِ شاعری کے لئے خونِ جگر کی ضرورت ہے ۔ مگر یہ خونِ جگر سُرخی و شگفتگیٔ فن بھی بنتا ہے ۔ میں نے سُرخی و شگفتگیٔ فن کے لئے صَرفِ خونِ جگر میں بخالت نہیں کی ۔

میں ایک لحاظ سے کنگال ہوں ، لیکن دوسرے اعتبار سے صاحبِ مال بھی ہوں :

اس غریبی میں بھی چلتے ہیں سر اُونچا کر کے
ہم بھی اے دوست گلِ ہدار ہیں اپنے گھر کے

میں مٹا ہوا ہوں مگر اس مٹنے میں بھی ایک آن بان ہے ۔ ایک وضع ہے ایک شان ہے :

سُنا ہے خاک بھی ہو کے ہم لاجواب ہوئے
اگر یہ سچ ہے تو اچھا ہوا ہم خراب ہوئے

الفاظ کی بات آگئی تو یہ بات عرض کر دوں کہ میری زندگی میں خیال ، بات اور شعر میں

کوئی بُعد یا فرق نہیں ہے۔ میں جس طرح جن الفاظ میں سوچتا ہوں ان ہی الفاظ میں باتیں کرتا ہوں۔ اور جن الفاظ میں باتیں کرتا ہوں ان ہی لفظوں میں شعر کہتا ہوں۔ فرق صرف ترتیب اور ترکیب کا ہوتا ہے۔ اس ترکیب اور ترتیب کو میں نے کتابوں سے حاصل نہیں کیا ہے۔ یہ میرا اپنا ہے اور کسی کے مشورے سے بھی نہیں اپنایا گیا ہے۔ یہ میرؔ کی پیروی نہیں۔ میں پیرو کسی کا نہیں۔ میں نے میرؔ کو کالج کا لکچرر بننے کے بعد اچھی طرح جانا اور پہچانا اور سمجھا۔ اور یہ بات ۱۹۶۶ء کے بعد کی ہے۔ اس سے قبل میں میرؔ کے چند اشعار جانتا تھا۔ کچھ حالات سے واقفیت تھی۔ میرے کالج کے دَورانِ تعلیم بی۔ اے آنرس یا ایم۔ اے کے نصاب میں میرؔ شامل نہیں تھے ——

میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے کہ میری شناسائی ابتدا ہی سے بھائی ظفر امام صاحب کے ذریعہ غالب سے ہوئی۔ مجھے غالبؔ کے صدہا اشعار اُس وقت بھی یاد تھے۔ اور اَب بھی ہیں —— غالب میرا دل پسند شاعر تھا۔ ہر موقع اور محل پر غالبؔ کے اشعار پڑھتا۔ جب غالب فلم آئی اور میں نے پہلے پہل غالبؔ فلم دیکھی تو دَورانِ تماشہ فلم کم دیکھا رویا زیادہ۔ فلم دیکھنے کے دَوران میں اسقدر رویا کہ سر میں درد ہونے لگا اور واپس آکر رات بھر روتا رہا —— اس قدر قُربت اور وابستگی کے باوجود میری شاعری کی دنیا میں غالبؔ کسی جھروکے سے جھانکتے بھی نظر نہیں آتے۔ آپ آسانی سے کہدیں گے کہ غالبؔ کی پیروی آسان نہیں۔ حالانکہ واقعتاً تاریخی اعتبار سے یہ غلط ہے۔ اگر پیروی میرے مزاج میں ہوتی تو میں بہ آسانی غالبؔ کی پیروی کرسکتا تھا۔ لیکن اتباع

میری خمیر فطرت کے خلاف ہے۔ میر سے کسی قدر جو مشابہت ہے، یہ مشابہت فن سے نہیں، زندگی سے آئی ہے، جس کا شعوری احساس بہت بعد میں مجھے ہوا ________

تو میں نے عرض کیا کہ جو میرے خیال کی زبان ہے وہی میری گفتگو کی۔ اور جو میری گفتگو کی زبان ہے وہی میرے اشعار کی زبان ہے۔ اور میرے خیال اور میری بول چال مستعار نہیں۔ مجھے اب اس کا احساس ہے کہ میرے طلبا میرے کلاس میں مجھ سے اس لئے بھی خوش رہتے ہیں کہ میرے اشعار ہی کی زبان میرے لکچروں میں انہیں ملتی ہے۔ میرے بزرگ پروفیسر اختؔر قادری نے بڑے اعتماد سے اس کی تاویل کی ہے کہ میؔر کی زبان در اصل بہاری مگدھی زبان ہے اور ایک رشتہ یوں ملتا ہے کہ میؔر کے پہلے اُستاد جنہیں واقعی میؔر نے اُستاد مانا ہے اور بڑی عظمت، محبت اور احترام سے ذکرِ میؔر میں جگہ دی ہے وہ مرزا جعفر علی خاں حسرؔت عظیم آبادی ہیں۔

تعمیر آرٹ کا بنیادی مقصد ہے۔ انسانیت کے گھاؤ دیکھے نہیں جاتے۔ میں نے اپنے گھاؤ کے آئینہ میں دُنیا کے گھاؤ دیکھے، دونوں کی ہم آہنگی نے مجھے رولایا۔ اگر مجھے گھاؤ نہ لگتے تو شاید مجھے دُنیا کے گھاؤ نظر نہیں آتے۔ مجھے اپنے گھاؤ سے پیار ہے، لیکن دُنیا کے گھاؤ سے دُکھ ہے۔ جی چاہتا ہے سارے گھاؤ مجھے لگ جائیں، دُنیا کا چہرہ صاف ستھرا ہو کر نکھر آئے۔ ؎

مرے دل کو ہے جنوں سے بڑی اعتقاد مندی
ترے سامنے اسی نے مجھے جراتِ سخن دی

یہی احساس، فن ہے۔ لیکن یہ احساس، فن کیسے بنتا ہے اور کیسے بنا، یہ مجھے پتہ نہیں ــــ اگر اپنا ہی زخم شعر بن سکتا تو ۱۹۴۶ء کے بعد میں فوراً شعر کہنے لگتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ درمیان میں پانچ چھ سال کا وقفہ ہے۔ اِس زخم نے مجھے آنکھیں عطا کیں اور وہ نظریں بخشیں جن سے میں اوروں کے زخم دیکھنے کے قابل ہوا اور زخموں نے آپس میں رابطہ پیدا کیا اور یہ فن کے لئے راستہ بنا۔ اِسی ترتیب کا نام غمِ دل اور غمِ دوراں کا امتزاج، غمِ جاں اور غمِ جاناں کا اشتراک، غمِ عشق اور غمِ روزگار کا اتحاد ہے۔ بغیر اس امتزاج، اشتراک اور اتحاد کے دیرپا فن وجود میں نہیں آسکتا۔ یہ باتیں میں ایک سخن شناس اور سخن فہم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، شاعر کی حیثیت سے نہیں۔ جب میں شعر کہتا ہوں تو مجھے یہ سب کچھ یاد نہیں رہتا۔ شعر کہتے ہوئے نہ میرے ذہن میں کوئی مقصد رہتا ہے، نہ موضوع، نہ کوئی منزل۔ بس ایک کش مکش رہتی ہے، ایک کرب رہتا ہے، ایک خوش گوار کرب۔ ایک تڑپ رہتی ہے، ایک خوش آہنگ تڑپ۔ دل کے جوڑوں میں ایک اینٹھن رہتی ہے، ایک پُر سُرور اینٹھن۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔
شعر کہنے کے بعد شاعر کو ایک اضطراب رہتا ہے، ایک ناقابلِ ضبط تقاضہ ہوتا ہے شعر سُنانے کا۔ میری ساری کیفیتیں اور ساری لذتیں شعر کہنے میں ہیں۔ ایک غزل کہتا ہوں اور ہفتوں بلکہ کبھی کبھی مہینوں گنگناتا رہتا ہوں، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی اور سُن نہ لے۔ اس دوشیزۂ فن پر کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ میں تنہا اس سے لذّت لینا چاہتا ہوں اور اسے تنہا پیار کرنا چاہتا ہوں۔

اگر کسی مشاعرہ میں یا ریڈیو پر غزل پڑھ لی تو پھر اُس غزل سے پیار کی گرمی اور لذت کی چاشنی کم ہو جاتی ہے۔ اسی لئے رفتہ رفتہ اشاعت و طباعت سے دل پھر گیا۔ میں اس کیفیت کی تشریح توجیح کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی اسے اچھا کہے یا بُرا کہے، اسے ہوشیاری کہے یا دیوانہ پن کہے۔ اور اب جب کہ یہ اچھا یا بُرا، ہوشیاری یا دیوانہ پن سب کے سامنے آ رہا ہے تو میں ان سطور میں اُس ہوشیاری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا جو سب یہ کہکر کرتے ہیں کہ اہل ذوق میری غلطیوں سے چشم پوشی کرلیں یا میری اصلاح فرمادیں جن کی آیندہ ایڈیشن میں تلافی کی جائے گی۔ میں نے کوئی بڑا فن نہیں پیش کیا ہے، نہ میں نے کوئی انقلابی قدم اٹھایا ہے۔ یہ تو پامالیوں کی وہ سرگذشت ہے جو ازل سے اِس وقت تک ہوتی آئی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔ یہ تو اُس کراہ کی صدائے بازگشت ہے جو انسان کے دل سے پہلی بار نکلی ہوگی اور یہ آواز اُس وقت تک سُنائی دے گی جب تک انسان اور اُس کا دل اور دل پر چوٹ لگنے کا سلسلہ اِس کائنات میں باقی رہے گا، یہ آواز کبھی پُرانی نہیں ہوتی اور کبھی پُرانی نہیں ہوگی۔ میرا فن بھی اُسی سلسلۂ آواز کی ایک کڑی ہے۔ میں نے اِسے نئے رنگوں سے نہیں سجایا ہے جن کے پُرانے ہو جانے کا خطرہ ہو۔ ہاں ایک بات عرض کروں گا ——

لوگ دل کی باتوں کو بہت زیادہ دماغی باتوں سے آراستہ کرکے اور تہہ دار بنا کر پیش کرنے کے عادی ہوتے جارہے ہیں۔ میں دل اور دماغ کو علاحدہ علاحدہ کارفرما اور عامل نہیں مانتا۔ دونوں کا عمل متوازی چلتا ہے، اس لئے انہیں متوازن ہی رہنا چاہئے۔ اور یہ توازن فطری ہے۔ بغیر

دونوں کے اشتراکِ عمل کے فن پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ میں "نکتۂ چند بہ پیچیدہ بیانے" کا بالکل قائل نہیں۔ میں دونوں میں کسی کو حاکم و محکوم، غالب و مغلوب نہیں سمجھتا۔ یہ دونوں ہنس مکھ ساتھی ہیں۔ ایک دوسرے کے فرماں بردار، ایک دوسرے کے یار، ایک دوسرے کے حال آشنا، رمز شناس معاون و مددگار ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے شانہ سے شانہ ملائے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ میرے یہاں دونوں کی ہم آہنگی ہم مزاجی مقدم ہے۔

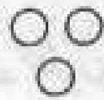
میں نے چبا کر بھی بات نہیں کی ہے، دل کھول کر رکھ دیا ہے اور "دل" والوں کے سامنے رکھا ہے، "دماغ" والوں کے سامنے نہیں۔ اور یقین سے رکھا ہے، اعتماد سے رکھا ہے۔ اُسی اعتماد سے جس اعتماد سے میر صاحب کہتے ہیں کہ:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سُنئے گا
کہتے کسی کو سُنئے گا تو دیر تلک سر دُھنئے گا

میں جانتا ہوں لوگ مجمع میں سر نہ دُھنیں گے محفلوں میں گردنیں کج کئے رہیں گے۔ لیکن جب وہ تنہائیوں میں، خلوتوں میں گنگنائیں گے، یا کتاب کھولینگے تو سر دُھنیں گے۔ زبان ہم آہنگ نہ ہو دل ہم آہنگ ہوگا۔ میرے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میری باتوں کا دشمن کوئی نہیں ہے۔ میرے مخالف بھی ہیں اور موافق بھی۔ لیکن اُس آواز کا کوئی دشمن نہیں ہے،

جو اِن الفاظ اور حروف کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ سب کے دل کا چور ہے اور سب کی دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ یہ صدائے دردِ حیات ہے، اِس درد میں سب مُبتلا ہیں۔ میں سب کے چہروں سے گذر کر دلوں کے اندر اُتر کر دیکھ چکا ہوں۔ مجھ سے کسی کا دل چھپا ہوا نہیں ہے۔ مجھے وہ مُسکراہٹیں کیا دھوکا دیں گی جن کا سرچشمہ خشک ہو چکا ہے، وہ عارض ولب کیا فریب دیں گے جو سُرخیٔ غازہ کے رہینِ منّت ہیں، یا کرامات بادۂ احمر کے احسان مند ہیں۔ اس لئے میں ڈرتے ڈرتے اور سہمتے سہمتے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے نہیں آرہا ہوں، بلکہ میں تو للکارتا ہوا آرہا ہوں کہ چھوڑیئے اِن جھوٹی مُسکراہٹوں کو اور پونچھئے اس بازاری سُرخیٔ غازہ کو —— اور

دیکھئے میری غزل میں کبھی صورت اپنی
یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے



کلیم عاجز

مقدمہ اشاعتِ سوم

سُلگنا اور شے ہے جل کے مر جانے سے کیا ہوگا
جو ہم سے ہو رہا ہے کام پروانے سے کیا ہوگا

بات سامنے کی ہے اور بہت سوں کے تجربے کی ہے اور ایک دنیا بغیر تجربے کے بھی اس منزل سے گذرتی ہے۔ کتنے پیاسے، کتنے ناآسودہ ایسے ہیں جنہیں اپنی تشنگی اور ناآسودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ کسی کے دل کی پکار سُن لیتے ہیں تو اُنہیں یاد آجاتا ہے کہ یہ تو میری ہی آواز ہے:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حالانکہ لذّت تقریر میں نہیں ہوتی، لذّت دل میں ہوتی ہے جسے تقریر نمایاں کر دیتی ہے۔ تمام فنون اور تمام شعر و ادب کا یہی کام ہے۔ پھُول کی پتّی سے ہیرے کا جگر کٹ جاتا ہے مگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر ہوتا ہے۔ حالانکہ مردِ ناداں اور مردِ دانا کے دل کی ساخت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ فن کا کام احساس پیدا کرنا نہیں، احساس کو بیدار کرنا ہے۔ جو دل احساس سے محروم ہیں وہاں اس کی پیدایش کا کیا سوال ہے۔

"وہ جو شاعری کا سبب ہوا" کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن نایاب ہے۔ دوسرا بھی دستیاب نہیں۔ اگر میخانے میں یہ آواز گونجتی رہی تو پیمانے آتے رہیں گے، ہاتھوں ہاتھ لبوں تک پہونچتے رہیں گے۔ اور ساقی سے مخاطب ہو کر کہا جاتا رہے گا:

یہ جام تو واللہ غضب کر گیا ساقی ایسی تو کبھی تو نے پلائی ہی نہیں تھی

اپنی شاعری کے دورِ آغاز میں جب یہ شعر کہا :

یہ کشش اظہارِ غم میں ہے کبھی جانا نہیں وہ بھی سر دھننے لگے ہیں جن کا افسانہ نہیں

تو واقعی یہی تجربہ تھا۔ آسودگانِ ساحل بھی ہم طوفان آشنا ستم رسیدوں سے ہم آہنگ ہو رہے تھے لیکن پھر تو یہ حال ہو گیا :

یہ قصہ ہے میرا اگر بیش و کم یہی آپ سب کا فسانہ بھی ہے

اب تو سمندر کے طوفان نے ساحل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اب تمام سمندر ہی سمندر ہے۔

اس ایڈیشن میں سولہ[۱۶] غزلوں کا اضافہ ہے۔ پاکستانی ایڈیشن میں چودہ[۱۴] غزلیں ہی تھیں۔ ابتدا میں غزلوں کے پہلے فہرست اس انداز سے دی گئی ہے کہ مطلوبہ غزل کا صفحہ فوراً مل جائے۔ بعض غزلوں میں کچھ اشعار ابھی حال میں اضافہ کئے گئے ہیں، جنہیں حاشئے میں دے دیا گیا ہے۔

میں نے جو کچھ کہا ہے اُسے آپ یا تمام احباب تاثیر سے لبریز کہتے ہیں۔ میں اُسے تاثیر نہیں کہتا۔ تاثیر تو ہر اُس آواز میں ہوتی ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ اس میں کچھ اور بھی ہے۔ اس میں ایک پکار ہے، ایسی پکار جس کے سب منتظر ہوں۔ جیسے کسی قافلے کے لوگ منتشر ہو گئے ہوں۔ سب کو تنہائی کا احساس ہو، لیکن تنہا کیسے ہوئے، کہاں سے ہوئے، کیوں ہوئے، یہ احساس نہ ہو۔ اس منتشر قافلے کو یکجا کر کے قافلہ بنانے کی ایک پکار ہے۔ جیسے میں نے شاید غیر شعوری طور پر تیس سال پہلے کہا تھا :

جمع ہونے تو دو اُجڑے ہوئے میخواروں کو پھر بنا لیں گے کوئی بزمِ خرابات نئی

یہ پکار بعد میں شعوری ہو گئی۔ اور پکار جاری ہے۔ دیکھئے یہ میخوار کب اکٹھے ہوتے ہیں اور نئی بزمِ خرابات کب بنتی ہے، اُس وقت تک : ہے مشورہ دوستوں کو میرا کہ کم نہ ہو گرمیِ تمنا

چراغ خلوت ہی میں جلاؤ اگر کوئی انجمن نہیں ہے

کلیم احمد عاجز

دعا

رات جی کھول کے پھر میں نے دعا مانگی ہے
اور اِک چیز بڑی بیش بہا مانگی ہے

اور وہ چیز نہ دولت نہ مکاں ہے نہ محل
تاج مانگا ہے نہ دستار و قبا مانگی ہے

نہ تو قدموں کے تلے فرشِ گہر مانگا ہے
اور نہ سر پر کُلہ بالِ ہما مانگی ہے

نہ شریکِ سفر و زادِ سفر مانگا ہے
نہ صدائے جرس و بانگِ درا مانگی ہے

نہ سکندر کی طرح فتح کا پرچم مانگا
اور نہ مانندِ خضر عمرِ بقا مانگی ہے

نہ کوئی عہدہ نہ کرسی نہ لقب مانگا ہے
نہ کسی خدمتِ قومی کی جزا مانگی ہے

نہ تو مہمانِ خصوصی کا شرف مانگا ہے
اور نہ محفل میں کہیں صدر کی جا مانگی ہے

میکدہ مانگا نہ ساقی نہ گلستاں نہ بہار
جام و ساغر نہ مئے ہوش رُبا مانگی ہے

نہ تو منظر کوئی شاداب و حسیں مانگا ہے
نہ صحت بخش کوئی آب و ہوا مانگی ہے

محفلِ عیش نہ سامانِ طرب مانگا ہے
چاندنی رات نہ گھنگھور گھٹا مانگی ہے

بانسری مانگی نہ طاؤس نہ بربط نہ رباب
نہ کوئی مطربہ شیریں نوا مانگی ہے

چین کی نیند نہ آرام کا پہلو مانگا
بختِ بیدار نہ تقدیرِ رسا مانگی ہے

نہ تو اشکوں کی فراوانی سے مانگی ہے نجات
اور نہ اپنے مرضِ دل کی شفا مانگی ہے

نہ غزل کے لئے آہنگ نیا مانگا ہے
نہ ترنم کی نئی طرزِ ادا مانگی ہے

سن کے حیران ہوئے جاتے ہیں اربابِ چمن
آخرش کون سی پاگل نے دعا مانگی ہے

آ۔ تیرے کان میں کہہ دوں اے نسیمِ سحری
سب سے پیاری مجھے کیا چیز ہے کیا مانگی ہے

وہ سراپائے ستم جس کا میں دیوانہ ہوں
اُس کی زلفوں کے لئے بوئے وفا مانگی ہے

"حادثۂ بیت المقدس کے چند دن بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ امیر شریعت بہار واڑیسہ نے فرمائش کی تھی کہ ایک نظم اس حادثہ جانکاہ پر لکھیں، یہ نظم اس دور میں متعدد اردو اخبارات اور ہفتہ وار رسالوں میں چھپی اور اس کی دو ہزار نقلیں مطبع میں چھاپ کر مدینہ منورہ لے جائی گئیں اور وہاں روضۂ اقدس پر تمام تقسیم کی گئیں، ہزاروں لوگوں کی زبانوں پر اس کے متفرق اشعار ہیں، میری تمام نعتیں اسی طرح کی مخصوص حادثہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو مختلف زمانے میں ملتِ اسلامیہ پر گزرے"

زخم کھائے ہوئے سر تا بہ قدم آئے ہیں
ہانپتے کانپتے یا شاہِ امم آئے ہیں

سرنگوں آئے ہیں با دیدۂ نم آئے ہیں
آبرو باختہ دل سوختہ ہم آئے ہیں

کھو کے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں
شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں

آپ کے سامنے جس حال سے ہم آئے ہیں
ایسے مجرم کسی دربار میں کم آئے ہیں

شرق سے غرب کہیں کوئی ٹھکانہ نہ ملا ٹھوکریں کھا کے ہر اک سمت سے ہم آئے ہیں

گرچہ بے سوز ہیں بے ساز ہیں بے ساماں ہیں پھر بھی خالی نہیں سرکار میں ہم آئے ہیں

لیکے اردن کے جوانانِ بنی ہاشم کا حوصلے آئے ہیں دم آئے ہیں ہم آئے ہیں

لیکے ہم پیشکشِ خدمتِ عالی کے لئے تحفۂ خونِ شہیدانِ حرم آئے ہیں

بیتِ مقدس کے غریب الوطنوں کا لیکر جگر سوختہ و دیدۂ نم آئے ہیں

مختصر یہ ہے کہ اس سینۂ سوزاں میں لئے وقت کا سب سے دہکتا ہوا غم آئے ہیں

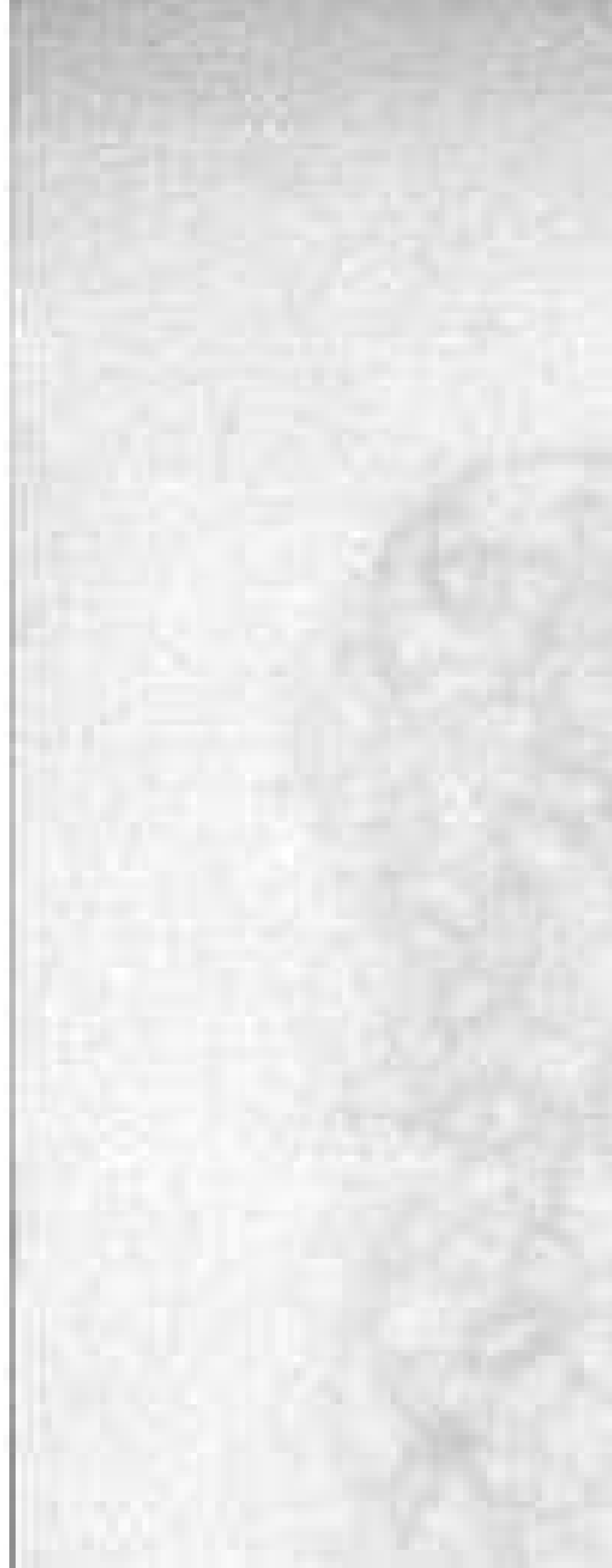
یہ غم ایسا ہے کہ پھر غم نہ کوئی یاد رہا یوں تو ہر دور میں رنج آئے ہیں غم آئے ہیں

آپکے سایۂ دامن سے جو ہم دور ہوئے ٹوٹ کر چار طرف اہلِ ستم آئے ہیں

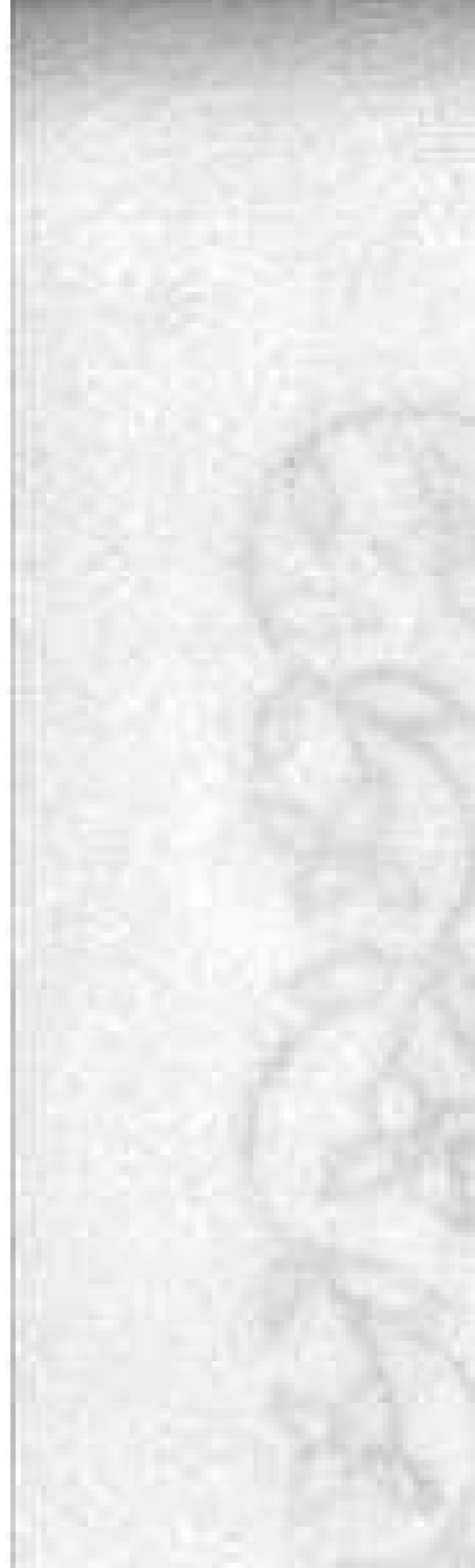
اور یہ کہتے ہیں کہ تم لوگ اسی قابل ہو
بہت آئیں گے مصائب ابھی کم آئے ہیں

اک نگاہِ غلط انداز کے سائل بن کر
مجرمانِ اُمم یا شاہِ اُمم آئے ہیں

اب تو اس در سے نہ سر اُٹھے گا انشاءاللہ
جان دیدیں گے یہیں سوچ کے ہم آئے ہیں



ابتدائی دور کی غزلیں





خوشی بیکار، غم ہے بے نتیجہ کون سمجھے گا؟
جو سمجھا ہے تجھے ہم نے اے دُنیا، کون سمجھے گا؟

یہاں جیب و گریباں ہی میں عزت سمجھی جاتی ہے
ہماری چاک دامانی کا رُتبہ کون سمجھے گا؟

ہمیں تو ہم زبانِ میکدہ ہیں ہم نہ سمجھیں گے
تو ساقی گفتگوئے جام و مینا کون سمجھے گا؟

گرادی اپنی قیمت ہم نے اپنی ہی نگاہوں میں
بُرا ہم خود ہی سمجھیں گے تو اچھا کون سمجھے گا؟

تم اہلِ انجمن میں جس کو چاہو بے وفا کہہ دو
تمہاری انجمن ہے تم کو جھوٹا کون سمجھے گا؟

یہ زُلفیں کس طرح سُلجھائیں ہم نے ہم سمجھتے ہیں
کسے سمجھانے جائیں، یہ بکھیڑا کون سمجھے گا؟

غنیمت ہے ابھی ہم ہیں سُنا لیجئے غزل عاجزؔ
ہمارے بعد اُردوئے مُعلیٰ کون سمجھے گا؟



دِل زمانہ ہوا شاداب نہیں شاد نہیں
کب بہار آئی تھی اِس باغ میں کچھ یاد نہیں

نہ نشیمن نہ گُلستاں کا پتہ چلتا ہے
اب کوئی خاک نہیں ایسی جو برباد نہیں

جو تمھارے لیے بے نام و نشاں ہو کے رہا
میں وہی ننگِ زمانہ ہوں، تمھیں یاد نہیں؟

اِس زمانے میں بھی یہ ظرف ہمارا دیکھو
غم وہ رکھتے ہیں جو شرمندۂ فریاد نہیں

ظلم اَب بھی وہی کرتے ہو جو کرتے آئے
تم ستمگر ہی فقط ہو، ستم ایجاد نہیں

سب ہی ممنونِ کرم اے غمِ دَوراں نکلے
کون گھر فیضِ قدم سے ترے آباد نہیں

کرلی اِس فن میں بھی گلچیں نے مہارت پیدا
سُن رہے تھے کہ چمن میں کوئی صیّاد نہیں



شام ایسی نہ اَب ایسی سحر مانگ رہی ہے
دُنیا نئی دُنیا کی خبر مانگ رہی ہے

معلوم نہیں، تم کو پتہ ہے کہ نہیں ہے
کچھ تم سے زمانے کی نظر مانگ رہی ہے

شبنم سے فقط کام چلا ہے نہ چلے گا
پھُولوں کی زباں خونِ جگر مانگ رہی ہے

افسوس کہ تعمیر کی فرصت نہیں مجھ کو
پھر خانہ خرابی مرا گھر مانگ رہی ہے

ایک شور ہے میں نے تمھیں پہچان لیا ہے
ہر آنکھ مرا ذوقِ نظر مانگ رہی ہے



کرتا نہیں جب اِن سے کوئی پیار، کیا کریں
دامن سے بھی نہ اُلجھیں اگر خار، کیا کریں؟

احباب خدمتِ رسن و دار کیا کریں
دیوانوں کا یہ کام ہے ہُشیار کیا کریں

ہم خود ہی التفات کے قابل نہیں رہے
تیری شکایت اے نگہہِ یار کیا کریں

دُنیا بغیرِ عشق ہمیں ناپسند ہے
یُوسف نہیں تو مصر کا بازار کیا کریں

آواز دے رہے ہیں تقاضے نئے نئے
اب گُفتگوئے کاکُل و رُخسار کیا کریں

ہم نے تو مہرباں لبِ فریاد سی لیے
زنجیر سے نکلتی ہے جھنکار کیا کریں



قائم ہے سرورِ مئے گلفام ہمارا
کیا غم ہے اگر ٹوٹ گیا جام ہمارا

اتنا بھی کسی دوست کا دشمن نہ ہو کوئی
تکلیف ہے اُن کے لیے آرام ہمارا

پھولوں سے محبت ہے تقاضائے محبت
کانٹوں سے اُلجھنا تو نہیں کام ہمارا

بھولے سے کوئی نام وفا کا نہیں لیتا
دُنیا کو ابھی یاد ہے انجام ہمارا

غیر آکے بنے ہیں سببِ رونقِ محفل
اب آپ کی محفل میں ہے کیا کام ہمارا

موسم کے بدلتے ہی بدل جاتی ہیں آنکھیں
یارانِ چمن بھول گئے نام ہمارا



ایسی بہار آئی کہ اب کے بہار میں
سایہ نہیں کسی شجرِ سایہ دار میں

کیا ہوگی اے جنوں تیری خاطر بہار میں
اِک پیرہن تھا وہ بھی نہیں اختیار میں

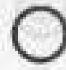
کیوں روشنی نہ ہو چمنِ روزگار میں
بیٹھا ہوں گھر کو آگ لگا کر بہار میں

تُو اے کرن اُمید کی ہے کس دیار میں
اب تو سحر سے شام ہوئی انتظار میں

کیا کیا نہ فصلِ گُل کی تمنا خزاں میں تھی
کرتے ہیں اب خزاں کی تمنا بہار میں

ہیں ایک ہی چمن میں مگر فرق ہے بہت
اُن کی بہار اور ہماری بہار میں

عاجزؔ یہ تم نے کیا غزل بے مزہ پڑھی
اِک شعر بھی نہیں صفتِ زُلفِ یار میں



انقلاباتِ چمن کا ترجماں بنتا رہا ۔۔۔ شعر جو کہتے رہے ہم داستاں بنتا رہا

خونِ دل سے نقشِ معنی و بیاں بنتا رہا ۔۔۔ اِک چمن مٹتا رہا اِک گلستاں بنتا رہا

دشتِ غربت میں غبارِ دشت کا احساں نہ پوچھ ۔۔۔ ہم جہاں جاتے رہے اک سائباں بنتا رہا

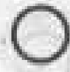
کم نہیں ہے آبِ حیواں سے محبّت کی شراب ۔۔۔ دِل یہ مے پیتا رہا اور نوجواں بنتا رہا

کچھ نہ کچھ اہلِ جنوں ہر دور میں باقی رہے ۔۔۔ اِک اگر لُٹتا رہا اِک کارواں بنتا رہا

کیفیت کس درد کی تجھ سے کہوں اے ہم نشیں ۔۔۔ روز ہی اِک دردِ دِل کا میہماں بنتا رہا

کوئی عاجزؔ کا شریکِ سوزِ غم بنتا نہیں

یوں تو جو آتا رہا وہ مہرباں بنتا رہا



اَب محفلِ سخن میں بھی لُطفِ سخن نہیں
دل انجمن نہیں تو کہیں انجمن نہیں

سودا نہیں جُنوں نہیں دیوانہ پن نہیں
جینا ہے گر یہی تو یہ جینے کا فن نہیں

غیروں کی انجمن تو ہے غیروں کی انجمن
اَب میری انجمن بھی مری انجمن نہیں

بے پردگی تو یہ ہے کہ سینہ ہے غم سے چاک
پردہ یہ ہے کہ چاک کہیں پیرہن نہیں

اِس غم کدے میں ہم بھی عجب وضعدار ہیں
دل ہے لہو لہان جبیں پر شکن نہیں

راحت سے احتیاط مصیبت سے ارتباط
عاجزؔ یہ اور کیا ہے جو دیوانہ پن نہیں



دل دے چکے ہیں عہدِ وفا کر چکے ہیں ہم
پہلے ہی اپنے حق میں بُرا کر چکے ہیں ہم

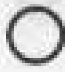
وہ انجمن اب اہلِ ستم کی ہے جلوہ گاہ
رَوشن جہاں چراغِ وفا کر چکے ہیں ہم

معلوم ہے جو قدرِ وَفا اُن کے دل میں ہے
سَو بار اُن سے عرضِ وفا کر چکے ہیں ہم

دُنیائے عشق وادیٔ پُرخار ہی سہی
اَب تو جنوں کو برہنہ پا کر چکے ہیں ہم

ہاں شوق سے حوالۂ دار و رَسن کرو
اَے دوست اب تو جُرمِ وَفا کر چکے ہیں ہم

کِس کِس جگہ بیاضِ وطن سے مٹاؤ گے
ہر ہر ورق پہ مُہرِ وَفا کر چکے ہیں ہم



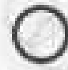
وہ محوِ ناز ہیں قدرِ نیاز کون کرے
اِدھر یہ شرم کہ دامن دراز کون کرے

ہمیں بھی رازِ بہارِ چمن کا ہے معلوم
سوال یہ ہے کہ افشائے راز کون کرے

اِسی لیے خلشِ زخمِ دل گوارا ہے
کہ منّتِ کرمِ چارہ ساز کون کرے

رہا نہ جب ہوس و عشق کا کوئی معیار
تو جُراُتِ گُنہِ امتیاز کون کرے

ہر ایک سمت ہے ہنگامۂ جنوں برپا
خرد سے بیٹھ کے راز و نیاز کون کرے



نہ پوچھ کیوں گلۂ دوستاں نہیں ہوتا
یہ درد وہ ہے جو مجھ سے بیاں نہیں ہوتا

رَوِش رَوِش پہ چمن کی کچھ ایسا عالم ہے
کہ امتیازِ بہار و خزاں نہیں ہوتا

اُس انجمن میں تلاشِ رفیقِ غم ہے مجھے
جہاں کسی کا کوئی رازداں نہیں ہوتا

قفس میں سب ہے میسّر پہ کیا کروں صیّاد
نظر سے دُور کبھی آشیاں نہیں ہوتا

میری وَفا کا زمانے میں دیکھ کر انجام
کسی کو حوصلۂ اِمتحاں نہیں ہوتا

یہ دھوم آپ کی زنجیر کی نہیں ہوتی
ہمارا پاؤں اگر درمیاں نہیں ہوتا



بنا کے لالہ و گُل کا مزار گذری ہے
جہاں جہاں سے نسیمِ بہار گذری ہے

یہ کس کا نقشِ قدم ہے پتہ نہیں چلتا
خزاں گئی ہے کہ فصلِ بہار گذری ہے

وہ رات اہلِ گُلستاں کبھی نہ بھُولینگے
جو زیرِ سایۂ زُلفِ بہار گذری ہے

نشانِ قافلۂ رنگ و بُو نہیں ملتا
صبا تلاش میں دیوانہ وار گذری ہے

غزل کے بھیس میں کس کس مقام سے عاجزؔ
حکایتِ رُخ و گیسوئے یار گذری ہے



ہم غریبوں پہ تو الزام ہے بیجا تیرا
اب تو اغیار بھی کرنے لگے شکوا تیرا

کھیل معلوم ہے سب اے ستم آرا تیرا
بیٹھے ہم دیکھتے رہتے ہیں تماشا تیرا

بے نشاں جیتے ہیں بے نام و نشاں مرتے ہیں
ہم تو رکھتے ہیں ہر اک حال میں پردا تیرا

عافیت جھوٹی تسلّی سے نہیں ہو سکتی
زخم دل پر کبھی ٹھہرا نہیں پھاہا تیرا

جوشِ وحشت میں بھی رکھتے ہیں گریباں محفوظ
یہ ہوا چاک تو کھل جائے گا پردا تیرا

پہلے اتنا ہوسِ جوشِ جنوں عام نہ تھا
اب تو بازار میں بکنے لگا سودا تیرا

رند کرتے ہیں شکایت تو غلط کرتے ہیں
میکدہ تیرا ہے، مے تیری ہے، مینا تیرا



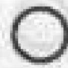
وہ چاہے۔ کوئی بلا سے نہ چاہے، یا چاہے
اُسی کو کہیے سُہاگن جسے پیا چاہے

کسے مجال ہے، مسند کہ بوریا چاہے
وہ دینے والا ہے دے جس کو دیا چاہے

وہ محترم نہ رہے گا کسی کی نظروں میں
تیری نظر جسے بے آبرو کیا چاہے

یہ دَور وہ ہے شرافت سنبھل نہیں سکتی
گریباں چاک ہو دامن اگر سیا چاہے

گُذر کے مرحلۂ دار سے بھی دیکھ لیا
یہ کام سہل ہے ہمّت اگر کیا چاہے



یوں تو ساقی جام بر کف ہے سبُو بر دوش ہے
کون جانے زہر ہے یا بادۂ سر جوش ہے

ہائے اربابِ نظر کی بے کسی بے چارگی
آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور زباں خاموش ہے

خیریت جیب و گریباں کی نہ ہم سے پُوچھیے
کس کو اس دورِ جُنوں میں پیرہن کا ہوش ہے

کیا قیامت ڈھائیگی جب تا کمر آ جائیگی
تیری زُلفِ فتنہ پرور جو ابھی تا دوش ہے

اَب چمن میں کوئی ہنسنے بولنے والا نہیں
جو کلی ہے وہ مرے دل کی طرح خاموش ہے



وقت کے در پر بھی ہے بہت کچھ وقت کے در سے آگے بھی
شام وسحر کے ساتھ بھی چلئے شام وسحر سے آگے بھی

دار ورسن کی ریشہ دوانی گردن وسر تک رہتی ہے
اہلِ جُنوں کا پاؤں رہا ہے گردن وسر سے آگے بھی

میرے گھر کو آگ لگا کر ہمسایوں کو ہنسنے دو
شعلے بڑھ کر جا پہونچے میرے گھر سے آگے بھی

عشق نے راہِ وفا سمجھائی، سمجھانے کے بعد کہا
وقت پڑا تو جانا ہوگا راہگذر سے آگے بھی

آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اس سے دھوکا کھائیں کیا
دل تو عاجز دیکھ رہا ہے حدِّ نظر سے آگے بھی



غزلیں

۱۹۵۲ء تا ۱۹۷۲ء

پہلی غزل

خوشی ہے کیا کسی آوارۂ وطن کیلئے
بہار آئی تو آیا کرے چمن کے لئے

نہ لالہ و گُل و نسریں نہ نسترن کے لئے
مٹے ہیں ہم کسی غارت گرِ چمن کے لئے

کبھی جو گوشۂ خلوت میں شمع ہاتھ آئی
لپٹ کے رو لئے یارانِ انجمن کے لئے

ہم اُن سے شکوۂ بیداد کیا کریں عاجز
یہاں تو پاسِ وفا قفل ہے دہن کے لئے

دسمبر ۱۹۳۹ء

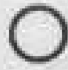


جُدا دیوانہ پن اب ایسے دیوانے سے کیا ہوگا
مجھے کیوں لوگ سمجھاتے ہیں سمجھانے سے کیا ہوگا

سُلگنا اور شئے ہے جل کے مر جانے سے کیا ہوگا
جو ہم سے ہو رہا ہے کام، پروانے سے کیا ہوگا

مرا قاتل اُنہیں کہتے ہیں سب اور ٹھیک کہتے ہیں
قسم سَو بار وہ کھائیں قسم کھانے سے کیا ہوگا

مناسب ہے سمیٹو دامنِ دستِ دُعا عاجزؔ
زباں ہی بے اثر ہے ہاتھ پھیلانے سے کیا ہوگا



کچھ انتہائے سلسلۂ غم نہیں ہے آج
ہر ظلمِ آخریں ستمِ اوّلیں ہے آج

میرے مذاقِ غم پہ ہر اک نکتہ چیں ہے آج
اُن کی طرف نگاہ کسی کی نہیں ہے آج

بدنام کر رہی ہے مجھے میری بندگی
ہر سنگِ آستاں پہ نشانِ جبیں ہے آج

درماں کہاں کہ پُرسشِ غم بھی نہ کر سکی
اتنی بھی اُس نگاہ کو فرصت نہیں ہے آج

پردہ حریمِ ناز کا اپنے بچائیے
فریاد کا مزاج بہت آتشیں ہے آج

انکار کر رہے ہیں وہ اُسی جرمِ قتل سے
جس کی گواہ ہر شکنِ آستیں ہے آج

زنجیر اپنا ہاتھ بڑھاتی ہی رہ گئی
دیوانۂ بہار کہیں سے کہیں ہے آج

عاجزؔ مری فغاں پہ ہر اک یوں خموش ہے
جیسے کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں ہے آج



چمن اپنا لُٹا کر بُلبلِ ناشاد نکلی ہے
مُبارک باد۔ تیری آرزو صیّاد نکلی ہے!

خدا رکھے سلامت تیری چشمِ بے مروّت کو
بڑی بے درد نکلی ہے بڑی جلّاد نکلی ہے

نکل کر دل سے آہوں نے کہیں رُتبہ نہیں پایا
چمن سے جب بھی نکلی بُوئے گُل۔ برباد نکلی ہے

لبِ بام آکے تم بھی دیکھ تو لو کیا تماشہ ہے
فغاں کی دوش پر لاشِ دلِ برباد نکلی ہے

پریشاں ہو کے جانِ زار کیا نکلی ہے سینے سے
کسی بیداد گر کی حسرتِ بیداد نکلی ہے



ستم کو بھی کرم ہائے نہاں کہنا ہی پڑتا ہے
کبھی نا مہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

بنائے زندگی دو چار تنکوں پر سہی لیکن
انہی تنکوں کو آخر آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

بھلا ہم اور تجھ کو ناز بردارِ عدو کہتے ؟
مگر اے بے نیازِ دوستاں! کہنا ہی پڑتا ہے

مری آہ و فغاں کو نالۂ بلبل سے کیا نسبت
مگر اک ہم وطن کو ہم زباں کہنا ہی پڑتا ہے

محبت خانۂ صیاد سے بھی ہو ہی جاتی ہے
قفس کو بھی کسی دن آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

بتوں سے اتنا دیرینہ تعلق باوجود اسکے
ہوا جو کچھ سرِ کوئے بتاں کہنا ہی پڑتا ہے

ہر اک محفل میں جا کر ہم غزل کہتے نہیں لیکن
جہاں وہ شوخ ہوتا ہے وہاں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مانا عشق میں ضبطِ فغاں کی شرط لازم ہے
الجھتا ہے جو دل دردِ نہاں کہنا ہی پڑتا ہے



محبت بھی کیے جاتے ہیں غم کھائے بھی جاتے ہیں
گنہ کرتے بھی جاتے ہیں سزا پائے بھی جاتے ہیں

جفا کرتے بھی ہیں عذرِ جفا لائے بھی جاتے ہیں
لہو پیتے بھی جاتے ہیں قسم کھائے بھی جاتے ہیں

اسی نے تم کو چمکایا ہمیں برباد کر ڈالا
وفا پر ناز بھی کرتے ہیں پچھتائے بھی جاتے ہیں

وہی ہر صبح اُمیدیں وہی ہر شام مایوسی
کھلے بھی جا رہے ہیں پھول مرجھائے بھی جاتے ہیں

مزا یہ ہے لیے بھی جا رہے ہیں جانبِ مقتل
تسلی بھی دیئے جاتے ہیں سمجھائے بھی جاتے ہیں

پڑے ہیں اس بُتِ کافر کے سنگِ آستاں ہو کر
مگر پامال بھی ہوتے ہیں ٹھکرائے بھی جاتے ہیں



زندگی مائلِ فریاد و فغاں آج بھی ہے
کل بھی تھا سینے پہ اِک سنگِ گراں آج بھی ہے

دلِ افسردہ کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں
بزم میں مجمعِ خستہ جگراں آج بھی ہے

تلخیٔ کوہ کنی کل بھی مرا حصّہ تھا
جامِ شیریں بہ نصیبِ دیگراں آج بھی ہے

زخمِ دل کے نہیں آثار بظاہر لیکن
چارہ گر سے گلۂ دردِ نہاں آج بھی ہے

آج بھی گرم ہے بازار جفاکاروں کا
کل بھی آراستہ تھی اُن کی دُکاں آج بھی ہے

گوشۂ امن نہیں آج بھی بُلبُل کو نصیب
چشمِ صیاد بہر سُو نگراں آج بھی ہے

آج بھی زخمِ رگِ گُل سے ٹپکتا ہے لہُو
خوں میں ڈوبی ہوئی کانٹوں کی زباں آج بھی ہے

زندگی چونک کے بیدار ہوئی ہے لیکن
چشم و دل پر اثرِ خوابِ گراں آج بھی ہے

اِس طرف جنسِ وفا کی وہی ارزانی ہے
اُس طرف اِک نگہِ لُطف گراں آج بھی ہے

حیف کیوں قسمتِ شاعر پہ نہ آئے عاجزؔ
کل بھی کمبخت رہا مرثیہ خواں آج بھی ہے

بلیغ جاوید



جہاں فریاد بھی گوشِ نزاکت پر گراں گزرے
ہم ایسی بے کسی کی زندگی سے مہرباں گزرے

اسیروں سے ذراہٹ کر نسیمِ گلستاں گزرے
کہیں ایسا نہ ہو دل پر ملالِ آشیاں گزرے

مُبارک برق تجھ کو لالہ و گُل کی نگہبانی
کہ اب تو گلستاں سے دردمندِ گلستاں گزرے

وطن سے بے کسی یوں لیکے نکلی ہے غریبوں کو
کہ جیسے کارواں کے بعد گردِ کارواں گزرے



کچھ اپنی زندگی نالوں میں کچھ فریاد میں گذری
جو باقی رہ گئی اندیشۂ بیداد میں گذری

خزاں کا دور گذرا خانہ بربادی کے ماتم میں
بہارِ گل بہارِ آشیاں کی یاد میں گذری

لہو جتنا رگوں میں تھا وفا کے جوش میں نکلا
زباں میں جتنی طاقت تھی ستم کی داد میں گذری

گذارا بندگیِ باغباں میں دورِ آزادی
اسیری پیرویِ خاطرِ صیاد میں گذری

نتیجہ کچھ نہ تھا عاجزؔ ہماری سعی و کوشش کا
خموشی میں جو گذری تھی وہی فریاد میں گذری



رنجِ خزاں میں شوقِ بہارِ چمن میں ہے
دیوانہ آج تک اُسی دیوانہ پن میں ہے

کھینچی ہے بیکسی نے یہاں ایک آہ سرد
سہمی ہوئی سی شمع وہاں انجمن میں ہے

آتی ہے صاف صاف جھلک زخم و داغ کی
دل اور بے حجابِ نقابِ سخن میں ہے

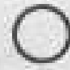
کچھ آستینِ برق میں ہے خاکِ آشیاں
کچھ دامنِ ہوائے بہارِ چمن میں ہے

ہر ناوکِ ستم یہ بتاتا ہے صاف صاف
اب زور کتنا بازوئے ناوک فگن میں ہے

جلنے دے جل رہا ہے دلِ بے زباں اگر
تو خوش تو ہے کہ شمع تیری انجمن میں ہے

آتی ہے پھر زباں پہ میری گفتگوئے حق
پھر ایک شور عالمِ دار و رسن میں ہے

عاجز کروں گا پیش میں کیا اہلِ بزم کو
بس اِک متاعِ غم مری جیبِ سخن میں ہے



غریبُ الوطن کا رہا کیا وطن میں — بہار آ رہی ہے تو آئے چمن میں

ہر اِک پھول خندہ بلب ہے چمن میں — میں کیا کہہ گیا اپنے دیوانہ پن میں

نہ اشکوں نے موقع دیا گفتگو کا — زباں رہ گئی آرزوئے سخن میں

کبھی ہم غریبوں کی خلوت میں آتی — بڑی دھوم ہے شمع کی انجمن میں

مِرے سُننے والے مجھے دیکھتے ہیں — میں بے پردہ نکلا نقابِ سخن میں

اِدھر میں سُناتا رہا دردِ پنہاں

اُدھر شمع روتی رہی انجمن میں



دردکب دل میں، مہرباں نہ رہا ہاں مگر قابلِ بیاں نہ رہا

ہم جو گلشن میں تھے بہار نہ تھی جب بہار آئی آشیاں نہ رہا

غم گراں جب نہ تھا گراں تھا مجھے جب گراں ہوگیا گراں نہ رہا

دوستوں کا کرم معاذاللہ شکوۂ جورِ دشمناں نہ رہا

بجلیوں کو دعائیں دیتا ہوں

دوش پر بارِ آشیاں نہ رہا



کلیجہ تھام لو، رُودادِ غم ہم کو سُنانے دو
تمھیں دُکھا ہوا دل ہم دکھاتے ہیں دِکھانے دو

اسی کے دم سے تھوڑی روشنی ہے خانۂ دل میں
بُجھاتے کیوں ہو شمعِ آرزو کو جھلملانے دو

یہ بجلی اِس دلِ خوابیدہ کو اک تازیانہ ہے
مری محرومیوں پر آسماں کو مُسکرانے دو

اُسی سے تم کسی کی زُلف کی روداد سُن لینا
اُدھر دیکھو وہ دیوانہ چلا آتا ہے آنے دو

سُنا ہے عشق کی معراج پنہاں ہے شہادت میں
چُھری لاؤ ہمیں بھی اپنی قسمت آزمانے دو

نہ داغ آئے گا اپنے دامنِ حسنِ طبیعت پر
وفا پر میری جو تہمت لگاتے ہیں لگانے دو

زمانہ صبر کر لیتا ہے عاجزؔ ہم بھی کر لینگے
خلش دل کی مٹا لینے کو دو آنسو بہانے دو

○

بہ ایں قیدِ خموشی بھی غزلخواں ہمہ تن ہم ہیں
نہ پابندِ زباں ہم ہیں نہ مجبورِ سخن ہم ہیں

گُلستاں میں شریکِ صحبتِ اہلِ چمن ہم ہیں
بس اتنی بات پر کیوں قابلِ دار و رسن ہم ہیں

جوابِ ظلم دیتی جا رہی ہے اپنی مظلومی
اُدھر تلوار رنگیں ہے اِدھر رنگیں کفن ہم ہیں

خزاں سے کب کی بُنیادِ گُلستاں گر چکی ہوتی
مگر یہ خیریت ہے زیرِ دیوارِ چمن ہم ہیں

نشیمن پھونک کے سمجھیں کہ سب کچھ پھونک ڈالا ہے
حجابِ گل میں بیٹھے بجلیوں پر خندہ زن ہم ہیں

اگرچہ بزم میں ہم بھی ہیں لیکن فرق کتنا ہے
وقارِ انجمن تم ہو۔ وبالِ انجمن ہم ہیں



جب صبا آئی اِدھر ذکرِ بہار آ ہی گیا
یاد ہم کو انقلابِ روزگار آ ہی گیا

کس لئے اب جبر کی تکلیف فرماتے ہیں آپ
بندہ پرور میں تو زیرِ اختیار آ ہی گیا

لالہ و گل پر جو گذری ہے گذرنے دیجئے
آپ کو تو مہرباں لُطفِ بہار آ ہی گیا

دہر میں رسمِ وفا بدنام ہو کر ہی رہی
ہم بچاتے ہی رہے دامن غبار آ ہی گیا

ہنس کے بولے اب تجھے زنجیر کی حاجت نہیں
اُن کو میری بے بسی کا اعتبار آ ہی گیا

شکوہ سنجی اپنی عادت میں نہیں داخل مگر
دل دُکھا تو لب پہ حرفِ ناگوار آ ہی گیا



میں کیا سناؤں حالِ دل اب قابلِ بیاں نہیں
زخم کدھر کدھر نہیں درد کہاں کہاں نہیں

یہ اور بات ہے کہ میں زحمت کشِ فغاں نہیں
پہلے بھی بے زباں نہ تھا آج بھی بے زباں نہیں

بُلبُلِ نامُراد کا جی نہ لگے تو کیا کرے
اب وہ چمن چمن نہیں آشیاں آشیاں نہیں

اپنے سِتم کا اور کچھ معیار کیجئے بلند
دار و رَسن میں اب کوئی لذتِ امتحاں نہیں

وہ دن اگر گذر گئے یہ بھی گذر ہی جائینگے
عیش بھی جاوداں نہ تھا رنج بھی جاوداں نہیں

اپنے کلام کا مجھے عاجزؔ سُرور کیوں نہ ہو
خود میرا فیضِ کسب ہے بخششِ دیگراں نہیں



سمن میں رنگ نہ بُو یا سمن میں آئی ہے
یہ کیسی فصلِ بہاراں چمن میں آئی ہے

ہر اک سر میں ہے سودائے امتحاں یارب
کشش کہاں سے یہ دار و رسن میں آئی ہے

عزیز کیوں نہ ہو خاکِ رہِ وطن مجھکو
یہ میرے ساتھ مرے پیرہن میں آئی ہے

وہ نامراد مری بے زباں وفا تو نہیں
جو، بن کے شمع تری انجمن میں آئی ہے

خبر دو بزمِ خرد کے تماشں بینوں کو
بہار پھر مرے دیوانہ پن میں آئی ہے

متاعِ درد ہر اک شخص کو نصیب نہیں
یہ چیز حصۂ اہلِ سخن میں آئی ہے



دھڑکتا جاتا ہے دل مسکرانے والوں کا
اُٹھا نہیں ہے ابھی اعتبار نالوں کا

یہ مختصر سی ہے رودادِ صُبحِ میخانہ
زمیں پہ ڈھیر تھا ٹوٹے ہوئے پیالوں کا

یہ خوف ہے کہ صبا لڑکھڑا کے گر نہ پڑے
پیام لے کے چلی ہے شکستہ حالوں کا

نہ آئیں اہلِ خرد وادیٔ جنوں کی طرف
یہاں گذر نہیں دامن بچاتے والوں کا

لپٹ لپٹ کے گلے مل رہے تھے خنجر سے
بڑے غضب کا کلیجہ تھا مرنے والوں کا



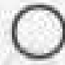
چمن میں برق کو پا کر مزاج داں میں نے
اُسی کو سونپ دی تقدیرِ آشیاں میں نے

جو اُس نے حالِ دلِ زخم خوردہ کا پوچھا
دِکھا دی خون میں ڈوبی ہوئی زباں میں نے

پہاڑ ٹوٹ پڑا غیرتِ اسیری پر
نگاہ کی تھی ذرا سوئے آشیاں میں نے

ہر ایک حلقۂ زنجیر دَم بخود کیوں ہے
یہ کس کی زُلف کی چھیڑی ہے داستاں میں نے

یہ ذکر برق و نشیمن نہیں ہے بے معنی
چھپائی ہے اِنہیں پردوں میں داستاں میں نے



مزاجِ عشق ہم رنگِ مزاجِ حُسن تو کر دے
غلامِ آرزو بن جا نہ ترکِ آرزو کر دے

دلِ بیتاب تو بھی دھڑکنیں اپنی سُنا دینا
نگاہِ شوق جب آغازِ رسمِ گفتگو کر دے

سُن اے ہمدم میں ایسی خواہشِ درماں سے باز آیا
مرے زخموں کو جو منّت پذیرِ چارہ جو کر دے

وہ پندارِ خودی جو بے خودی پر حرف لاتا ہو
اُسے اے دل سپُردِ آتشِ جام و سبو کر دے

بھلا کیا واسطہ اُس کو ہوس کی تلخ کامی سے
جسے تیری نظر لذت شناسِ آرزو کر دے

مِرے اشکوں کا ہے اِک خاص اندازِ بیاں لیکن
کہیں برہم نہ تجھ کو یہ طریقِ گفتگو کر دے

مرا یہ حوصلہ تھا تو ہی خنجر آزما ہوتا
تجھے یہ فکر ہے میری چھُری میرا گلو کر دے

غزل گوئی میں کچھ لطفِ غزل خوانی لئے ہے عاجزؔ
صدائے ساز میں آمیزشِ سوزِ گلو کر دے



جو سبب بن گیا محفل کی پریشانی کا
وہ فسانہ تھا مری سوختہ سامانی کا

آئینہ دار ہے سوزِ غمِ پنہانی کا
قطرہ قطرہ مری بھیگی ہوئی پیشانی کا

دنگ ہیں پرسشِ احوال کو آنے والے
مجھ کو دیکھیں کہ تماشہ مری ویرانی کا

اپنی صورت پہ جو سکتے کا سماں طاری ہے
آئینہ پر بھی وہ عالم نہیں حیرانی کا

کوئی مشکل نہ تھی تعمیرِ نشیمن لیکن
پاس تھا خانۂ صیاد کی ویرانی کا

باخبر خوب تقاضائے سلاسل سے ہیں
اے جنوں وقت تو ہو سلسلہ جنبانی کا

ہم تو اُس وقت سے مشہور ہیں آشفتہ خیال
زلف نے خواب نہ دیکھا تھا پریشانی کا

چند آہوں کا مرقع ہے کلامِ عاجزؔ
ڈال رکھا ہے نقاب اس پہ غزل خوانی کا



نہ پوچھو آج کیا کیا ناز ہے حُسنِ خود آرا کو
اِنہی آنکھوں سے ہم نے برہنہ دیکھا ہے دُنیا کو

غلط الزام دیتا ہے سلوکِ خارِ صحرا کو
گُلوں نے کون سا آرام پہونچایا کفِ پا کو

اگر دُنیا ہمیں آتی ہے سمجھانے کو آنے دو
کہ ہم اچھی طرح سمجھے ہوئے بیٹھے ہیں دُنیا کو

نیازِ عاشقی اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا
بجا کہنے لگا ہوں آپ کے ہر نازِ بیجا کو

بظاہر حاصلِ زخمِ جگر کچھ ہے تو اتنا ہے
اِک اچھا مشغلہ ہاتھ آگیا ہے چارہ فرما کو

مِرے جوشِ جنوں کے پاؤں پھیلانے کا وقت آیا
خردمندوں سے کہدو اب سمیٹیں اپنی دُنیا کو



وہ تماشائے جنوں وہ رقصِ مستانہ نہیں — جب سے تیری انجمن میں تیرا دیوانہ نہیں

یہ کشش اظہارِ غم میں ہے کبھی جانا نہیں — وہ بھی سر دھننے لگے ہیں جن کا افسانہ نہیں

وہ نگاہیں ہیں نہ وہ تیور نہ وہ انداز ہے — دو ہی دن میں تم تو یوں بدلے کہ پہچانا نہیں

کوئی گلشن بھی نہ تھا میرے گلستاں کا جواب — اب سنا ہے اُس سے بڑھ کر کوئی ویرانہ نہیں

امتحاں گاہِ وفا سے گرچہ گذرے اور بھی — ہم نے اوروں کی طرح دامن تو گردانا نہیں

مجھکو ساقی تیرا حالِ میکدہ معلوم ہے — کل مے و مینا نہیں تھے آج پیمانہ نہیں

مجھکو یارانِ طریقت کی ہے رُسوائی کا پاس — ورنہ کس کعبے کے پردے میں صنم خانہ نہیں

اُن کو اب معلوم ہوتی ہے وفاداروں کی قدر — جل رہی ہے شمع لیکن رقصِ پروانہ نہیں

میکشوں کے چشم و لب سے جو نمایاں ہو سکے
اُس سے بڑھ کر مستند رودادِ میخانہ نہیں



مجھکو وہ غم ملا جس غم کی ہے ہر بات نئی
جس کا ماحول نیا جس کی روایات نئی

وصلِ لیلیٰ کی دُعاؤں کا کہاں وقت رہا
اب تو ایجاد ہوئی طرزِ مناجات نئی

رسم گریہ کی بہت عام ہوئی جاتی تھی
میری آنکھوں کو عنایت ہوئی برسات نئی

اُن نگاہوں کا میں احسان نہ مانوں کیونکر
جو مجھے بخش گئیں شورشِ جذبات نئی

جن سے وصفِ لب و دنداں ہی کیا کرتے تھے
جھلملائیں اُنہیں حرفوں میں حکایات نئی

باغباں کچھ متفکّر سا نظر آتا ہے
ہو نہ ہو باغ میں پھوٹی ہے کوئی بات نئی

جمع ہونے تو دو اُجڑے ہوئے میخواروں کو
پھر بنا لیں گے کوئی بزم خرابات نئی



کہتے ہیں مساوات اسی کو تو ستم ہے
اتنی ہی خوشی اُن کو ہے جتنا مجھے غم ہے

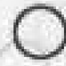
جو کچھ مجھے تکلیف ہے جو کچھ مجھے غم ہے
سب آپ کی بخشش ہے عنایت ہے کرم ہے

کیفیتِ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم
ہم جانتے ہیں درد زیادہ ہے کہ کم ہے

ساقی ترے میخانے سے کتنے گئے پیاسے
سچ کہنا تجھے ساغر و مینا کی قسم ہے

وقت آجائے تو شمشیر کی آجاتی ہے تیزی
غفلت میں نہ رہنا کہ یہ شاعر کا قلم ہے

ہر ایک طرف شام کے آثار ہیں عاجز
بڑھنا ہے تو بڑھ جا کہ اندھیرا ابھی کم ہے



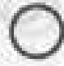
سنبھلنے ہی نہیں دیتا غمِ یارانِ میخانہ
کہاں کی مے کشی کیسی صُراحی کیسا پیمانہ

غبارِ کارواں سے کارواں کو ہم نے پہچانا
جہاں تھی شمع محفل اُڑ رہی ہے خاکِ پروانہ

ادا کیونکر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ
بہت دُشوار ہے جتنا سمجھنا اتنا سمجھانا

مجھے تشنہ لبوں کی یاد مے پینے نہیں دیتی
اُٹھاتا جا رہا ہوں ٹوٹتا جاتا ہے پیمانہ

شکستِ جام کو ساقی شکستِ دل سے کیا نسبت
ترا اِک آئینہ ٹوٹا، ہمارا آئینہ خانہ



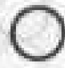
دیکھ کر ہنستے ہیں سب آشفتہ سامانی مری
اِک تماشہ بن گئی ہے چاک دامانی مری

باغباں نغموں کو میرے اجنبی سمجھا کیا
لالہ و گُل نے مگر آواز پہچانی مری

دُور ہی سے وہ گذر جاتے ہیں مُنھ پھیرے ہوئے
اُن سے بھی دیکھی نہیں جاتی پریشانی مری

اُن پہ تو سوزِ وفا کا کچھ اثر ہوتا نہیں
پھونک ڈالے گی مجھی کو شعلہ سامانی مری

اُن کے سُلجھانے میں جب دِقّت تمہیں محسوس ہو
اپنی زلفوں کو دِکھا دینا پریشانی مری



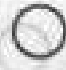
سوز پروانے کو دینے والے گئے شمع کا قلب گرمانے والے گئے
تھے وہی باعثِ رونقِ انجمن جو تری انجمن سے نکالے گئے

میکدے میں اب اہلِ ہوس رہ گئے دوسروں کی خبر لینے والے گئے
مجھکو محرومِ جام و سبُو دیکھ کر بادہ خواروں میں ساغر اُچھالے گئے

ہم پہ ایسی خطاؤں کا الزام ہے جن سے کوئی تعلق ہمارا نہیں
آگ تھی دُشمنوں کی لگائی ہوئی ہم تو ناحق مصیبت میں ڈالے گئے

عشق آساں بھی ہے اور مشکل بھی ہے پھول بھی ہیں گلستاں میں کانٹے بھی ہیں
تیرے دیوانے دیوانہ پن میں رہے ہوشیار اپنا دامن بچالے گئے

اہلِ عشق اب کہاں اہلِ دل اب کہاں ہُو کا عالم محبت کی دُنیا میں ہے
اس قدر بھاؤ بازار کا گر گیا لوگ اپنی دُکانیں اُٹھالے گئے



وہ کسی کی انجمن ہو وہ کسی کی بادشاہی
یہی بانکپن رہے گا یہی اپنی کج کلاہی

ترے نکھرے عارضوں میں ترے سنورے گیسوؤں میں
مری صبح کی چمک ہے مری شام کی سیاہی

تجھے گر یقیں نہ آئے تو میں آئینہ دکھادوں
ترا حُسن دے رہا ہے مرے عشق کی گواہی

جو تمھارے عہد میں ہے کسی دَور میں نہیں تھی
یہ خرد کی تیز دستی یہ جنوں کی بے پناہی

مرے حق میں دوستوں کا یہی فیصلہ ہے عاجزؔ
کہ گُناہ سے ہے بڑھ کر ترا جُرمِ بے گناہی



ستم سازیوں میں جو بے باک نکلے وہ اب جُرم سے پاک ہونے چلے ہیں

چُھری گردنِ آرزُو پر چلا کر لہُو اپنے دامن سے دھونے چلے ہیں

خوشی سے تو پھُولے سماتے نہیں ہیں دِکھانے کو پلکیں بھگونے چلے ہیں

جنہیں مُسکرانے سے فرصت نہیں تھی مرے حال پر آج رونے چلے ہیں

ہوس تو زمانے میں بدنام ہی تھی محبت بھی دُنیا میں برباد نکلی

جنہیں ہم نے پھُولوں کی مانند رکھّا وہی ہم کو کانٹے چبھونے چلے ہیں

مری بے بسی کس قدر معتبر ہے نہ فریاد کا غم نہ آہوں کا ڈر ہے

مجھے ہر طرح پا بہ زنجیر کر کے وہ اب پاؤں پھیلا کے سونے چلے ہیں



آرزو دامن ہی پھیلاتی رہی　　فصلِ گُل آتی رہی جاتی رہی

ہوشیاری کا تقاضا تھا کچھ اور　　بے خودی کچھ اور سمجھاتی رہی

شمع و پروانہ کا جو انجام ہو　　آپ کی محفل تو گرماتی رہی

دوست میرے حال پر روتے رہے　　مجھکو رہ رہ کر ہنسی آتی رہی

انجمن والوں کو شمعِ انجمن　　درد کا مفہوم سمجھاتی رہی

سازِ دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی　　ہلکی ہلکی سی صدا آتی رہی

میں رہا ہر چند سرگرمِ فغاں
نیند کے ماروں کو نیند آتی رہی



متاعِ غم کہاں اہلِ ہوس کے سینوں میں
یہ شئے ملے گی تو ہم بوریہ نشینوں میں

وہ اور ہوں گے جنھیں شوقِ خود نمائی ہے
یہاں تو عمر ہی گذری ہے نکتہ چینوں میں

سمجھ رہے ہیں کہ دریائے غم بھی ہے پایاب
وہ چند لوگ جو بیٹھے رہے سفینوں میں

نثار ہو گئے دار و رسن پہ اہلِ جنوں
یہ بندگانِ خرد تھے تماش بینوں میں

نہ آ فریب میں رنگیں قباؤں کے عاجز
چھری چھپائے ہوئے ہیں یہ آستینوں میں



امتحانِ شوق میں ثابت قدم ہوتا نہیں
عشق جب تک واقفِ آدابِ غم ہوتا نہیں

اُن کی خاطر سے کبھی ہم مُسکرا اُٹھے تو کیا
مُسکرا لینے سے دل کا درد کم ہوتا نہیں

جو ستم ہم پر ہے اُس کی نوعیّت کچھ اور ہے
ورنہ کس پر آج دُنیا میں ستم ہوتا نہیں

تم جہاں ہو بزم بھی ہے شمع بھی پروانہ بھی
ہم جہاں ہوتے ہیں یہ ساماں بہم ہوتا نہیں

رات بھر ہوتی ہیں کیا کیا انجمن آرائیاں
شمع کا کوئی شریکِ صبحِ غم ہوتا نہیں

مانگتا ہے ہم سے ساقی قطرے قطرے کا حساب
غیر سے کوئی حسابِ بیش و کم ہوتا نہیں



ستم ساز گرچہ یہاں اور بھی ہیں
مرے مہرباں مہرباں اور بھی ہیں

چمن ہے تو جورِ خزاں اور بھی ہیں
زمیں چاہئے آسماں اور بھی ہیں

اکیلی نہیں ہے تو اے شمع محفل
ترے چند ہم داستاں اور بھی ہیں

چراغ سرِ رہگذر تیز رکھیو
مسافر پسِ کارواں اور بھی ہیں

ستم کر دیا التجائے وفا نے
سُنا ہے وہ اب بدگماں اور بھی ہیں

یہی سوچ کر کچھ تسلّی ہے دل کو
مری طرح بے خانماں اور بھی ہیں



وہ بے درد ہیں کیوں نہ بیداد کرتے
مجھے شرم آتی ہے فریاد کرتے

ہر اک ظلم کی اِک الگ نوعیت تھی
کسے بھول جاتے کسے یاد کرتے

قفس بھی نہ ہوتا تو ہم بے کسی میں
نہ جانے کہاں وقت برباد کرتے

ہمیں کو خبر جب ہماری نہیں ہے
اُنہیں کیا پڑی تھی کہ وہ یاد کرتے

خدا جانے کس کس پہ اِلزام آتا
اگر ہم بیاں اپنی روداد کرتے

نہ پُوچھا کبھی حالِ دل تم نے ورنہ
وہ قصہ سُناتے کہ تم یاد کرتے



اگر بہارِ چمن تم اسی کو کہتے ہو — تو اس طرح کی بہارِ چمن سے کیا ہوگا

مرے جنوں پہ ابھی اہلِ ہوش ہنستے ہیں — سمجھ رہے ہیں کہ دیوانہ پن سے کیا ہوگا

بجھے ہوئے ہیں دلِ اہلِ انجمن کے چراغ — بس ایک شمعِ سرِ انجمن سے کیا ہوگا

جو دل بتوں کی اداؤں سے رام ہو نہ سکا — بھلا وہ شعبدۂ برہمن سے کیا ہوگا

ضرور فیصلہ کیجئے جنوں کی قسمت کا

مگر یہ فیصلہ دار و رسن سے کیا ہوگا



کالے بادل جب لہرائے آنکھوں میں آنسو بھر آئے
دل پر کیا کیا دور نہ آئے کس کو روئے کس کو گائے
پھول کھلے کھل کر مرجھائے رہ گئے ہم دامن پھیلائے
ہم تو دیوانے کہلائے کون تیری زلفیں سلجھائے
میرا لہو ان کے کام آئے کس کی دولت کون لٹائے

اپنی دولت زخم اور آنسو
پھول چُنے موتی بکھرائے



غم و راحت سے بیگانے بہت ہیں
ہمارے جیسے دیوانے بہت ہیں

محبت ایسی دُنیا ہے کہ جس میں
گلستاں کم ہیں ویرانے بہت ہیں

برہمن ہم سے بگڑا ہے تو بگڑے
خدا رکھے صنم خانے بہت ہیں

مُبارک خُم کے خُم اہلِ ہوس کو
مجھے دو چار پیمانے بہت ہیں

قفس میں رنجِ تنہائی نہ ہوگا
وہاں بھی جانے پہچانے بہت ہیں

مِری جیسی کہانی کم سُنو گے
گُل و بُلبُل کے افسانے بہت ہیں



نہ خوشی یاد رہی مجھکو نہ غم یاد رہا
ہاں ترا سِلسلۂ حُسنِ کرم یاد رہا

نہ مجھے جام رہا یاد نہ جم یاد رہا
کچھ نہ ساقی تری آنکھوں کی قسم یاد رہا

کچھ تمھیں سے نہیں وعدہ شکنی کا شِکوہ
کس کو اس دَور میں پیمانِ کرم یاد رہا

ہم تو دیوانگیٔ عشق میں سب بھول گئے
شیخ۔ کیوں کر تجھے آداب حرم یاد رہا

شُکر یہ ہے کہ میں احسان فراموش نہیں
عُمر بھر آپ کا بخشا ہوا غم یاد رہا

کیا خبر بے خودیٔ شوق کہاں لے جاتی
خیریت ہے کہ ترا نقش قدم یاد رہا



نہ وہ محفل جمی ساقی نہ پھر وہ دورِ جام آیا
ترے ہاتھوں میں جب سے میکدہ کا انتظام آیا

چمن کے ساتھ احسانِ رفاقت کچھ نہ کام آیا
نہ غنچوں نے کبھی پوچھا نہ پھولوں کا سلام آیا

وفاداروں میں گرچہ اور لوگوں کا بھی نام آیا
ہمیں آگے رہے جب آزمائش کا مقام آیا

الگ بیٹھے ہیں جو آدابِ مے نوشی سے واقف تھے
جسے پینا نہیں آتا اُسی کے ہاتھ جام آیا

بہت تعریف اُن کی، اُنکی محفل کی ہوئی لیکن
نہ شمعِ بزم یاد آئی نہ پروانوں کا نام آیا

بھرم کھل جائیگا عاجز تری نغمہ سرائی کا
اگر اربابِ فن کے سامنے تیرا کلام آیا



کیوں نہ آمادہ ہو وہ مجھکو مٹانے کے لئے
میری بربادی میں راحت ہے زمانے کے لئے

ہم کسے ڈھونڈھیں شریکِ غم بنانے کے لئے
پھول ہنسنے کو ہیں غنچے مُسکرانے کے لئے

وہ تو کہئے ہم نے رکھ لی آشیانے کے لئے
ورنہ اتنی آگ کافی تھی زمانے کے لئے

بڑھ کے خود کانٹوں پہ رکھدیں ہم نے اپنی انگلیاں
اُس سراپا ناز کا دامن بچانے کے لئے



آبرو کھوتے نہ میخانے میں ہم
آ گئے ساقی کے بہکانے میں ہم

چن لئے اوروں نے گلہائے مُراد
رہ گئے دامن ہی پھیلانے میں ہم

بھولتے جاتے ہیں تعلیمِ جنوں
آپ کی زلفوں کو سلجھانے میں ہم

بن گئے نقش و نگارِ آئینہ
دوستوں کے آئینہ خانے میں ہم

اپنے زخموں سے چراغاں کر گئے
تیری محفل تیرے کاشانے میں ہم

آزماتے ہیں برہمن کا خلوص
چند دن رہ کر صنم خانے میں ہم



نہ ہو فرق اور کوئی یہی فرق کم نہیں ہے
مجھے کچھ خوشی نہیں ہے تجھے کوئی غم نہیں ہے

اُسے ہوگئی جو سیری تو سمجھ رہا ہے ساقی
کہ کسی کو میکدے میں غمِ بیش و کم نہیں ہے

یہ تو شرطِ دوستی ہے کہ نباہ کر رہا ہوں
مجھے ورنہ برہمن سے ہوسِ صنم نہیں ہے

اُنہیں انجمن مُبارک مجھے فکر و فن مُبارک
وہاں روشنی بہت ہے تو یہاں بھی کم نہیں ہے



نہوں گے بادہ کش تو بادۂ گُلفام کیا ہو گا　　یہ شیشہ یہ صراحی یہ سبو یہ جام کیا ہو گا

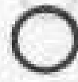
ہمارا حال اے ساقی ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا　　تری محفل اگر اُجڑی ترا انجام کیا ہو گا

ہمیں تو رنگِ گُلشن دیکھ کر افسوس ہوتا ہے　　سحر ہی کا یہ عالم ہے تو وقتِ شام کیا ہو گا

زمانہ جانتا ہے کس کا دامن چاک کتنا ہے　　ترے بدنام کرنے سے کوئی بدنام کیا ہو گا

تمھارے چاہنے والے مبارک ہوں تمھیں لیکن

جو ہم نے کر دیا وہ دوسروں سے کام کیا ہو گا



مری مستی کے افسانے رہیں گے　　جہاں گردش میں پیمانے رہیں گے

نکالے جائیں گے اہلِ محبّت　　اب اِس محفل میں بیگانے رہیں گے

یہی اندازِ مے نوشی رہے گا　　تو یہ شیشے نہ پیمانے رہیں گے

رہے گا سلسلہ دار و رسن کا　　جہاں دو چار دیوانے رہیں گے

جنہیں گلشن میں ٹھکرایا گیا ہے　　اُنہی پھولوں کے افسانے رہیں گے

خرَد زنجیر پہناتی رہے گی

جو دیوانے ہیں دیوانے رہیں گے



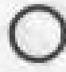
تجھے کیا اگر ترے واسطے کوئی زندگی سے گذر گیا — تری زلف اور سنور گئی ترا حُسن اور نکھر گیا

تری قدر و قیمتِ حُسن کی تجھے کون دیکے خبر گیا — نہ تری نگاہ اُدھر اُٹھی نہ ترا خیال اُدھر گیا

کوئی طنز میرے خیال پر کوئی میرے حال پہ کر گیا — میں نگاہ نیچی کیے ہوئے تری انجمن سے گذر گیا

مجھے دل کے حال کا غم نہیں مگر اسکا غم تو ضرور ہے — کہ اُسی نے توڑا یہ آئینہ جو اِس آئینے میں سنور گیا

اُنہیں ناز اپنے جمال پر مجھے فخر اپنے کمال پر
وہ ستم کی حد سے نکل گئے میں وفا کی حد سے گذر گیا



قفس میں لالہ و سرو وسمن کی بات کرتے ہیں
کہاں بیٹھے ہوئے کس انجمن کی بات کرتے ہیں

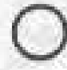
زمانہ سرحدِ دیر و حرم سے بڑھ گیا آگے
مگر ہم ہیں کہ شیخ و برہمن کی بات کرتے ہیں

جنوں کو عقل کا پابند کرنے کی ہدایت ہے
اب اہلِ ہوش بھی دیوانہ پن کی بات کرتے ہیں

سُنے گا کون میری چاک دامانی کا افسانہ
یہاں سب اپنے اپنے پیرہن کی بات کرتے ہیں

ہمارا ذکر کیا اب تو جنابِ شیخ صاحب بھی
اسی کافر کی زلفِ پرشکن کی بات کرتے ہیں

یہ اربابِ خرد یہ زلف و رُخ سے کھیلنے والے
ہمارے سامنے دار و رسن کی بات کرتے ہیں



دیکھ لی آہ کی تاثیر اثر ہونے تک
شب کو جو حال تھا باقی ہے سحر ہونے تک

انقلابات ابھی دیکھئے لائے کیا کیا
دوش سے زلف تری تا بہ کمر ہونے تک

رقص پروانے کا اے شمع تماشا ہی سہی
نہ رہے گا یہ تماشا بھی سحر ہونے تک

اور ہے آج تری راہگذر کا عالم
اور عالم تھا تری راہگذر ہونے تک

بزم میں ہم تپشِ سوزِ وفا کوئی نہیں
شمع نے ساتھ دیا وہ بھی سحر ہونے تک

اب تو ہے دل کو فراغت ہی فراغت حاصل
تھا غمِ نوعِ دگر، نوعِ دگر ہونے تک

مجھکو رونے سے نہ کر منع کہ مجبوری ہے
صبر ہوتا تو ہے اے دوست مگر ہونے تک



حقیقتوں کا جلال دیں گے صداقتوں کا جمال دینگے
تجھے بھی ہم اے غمِ زمانہ غزل کے سانچے میں ڈھال دینگے
تپش پتنگوں کو بخش دینگے لہو چراغوں میں ڈھال دینگے
ہم اُن کی محفل میں رہ گئے ہیں تو اُن کی محفل سنبھال دینگے
نہ بندۂ عقل و ہوش دینگے نہ اہلِ فکر و خیال دینگے
تمہاری زلفوں کو جو درازی تمہارے آشفتہ حال دینگے
یہ عقل والے اسی طرح سے ہمیں فریب کمال دینگے
جُنوں کے دامن سے پھول چُن کر خرد کے دامن میں ڈال دینگے
ہماری آشفتگی سلامت سُلجھ ہی جائے گی زلفِ دوراں
جو پیچ و خم رہ گیا ہے باقی وہ پیچ و خم بھی نکال دینگے
جنابِ شیخ اپنی فکر کیجئے کہ اب یہ فرمانِ برہمن ہے
بُتوں کو سجدہ نہیں کرو گے تو بتکدے سے نکال دینگے



نہ ضمیر شمس و قمر میں ہے نہ مزاج برق و شرر میں ہے
وہ تپاک جو مرے دل میں ہے وہ تپش جو میرے جگر میں ہے

مرے عزم میں ہے وہ چاندنی مرے شوق میں ہے وہ روشنی
جو نہ چشمِ راہ نما میں ہے نہ چراغِ راہگذر میں ہے

مرے نالہ میں ہے وہ دلکشی مری آہ میں ہے وہ سادگی
جو پیام خندۂ صبح میں نہ خرامِ بادِ سحر میں ہے

ابھی غنچہ و گُل و لالہ میں نہ وہ تازگی نہ وہ رنگ و بو
نہیں تیرے خواب و خیال میں جو بہار میری نظر میں ہے

شبِ تار میں بھی جنوں مرا کئی منزلوں سے گذر گیا
ترے عقل و ہوش کا قافلہ ابھی انتظارِ سحر میں ہے

جو سُنا رہا ہے غزل تمھیں یہ وہی کلیم ہے مہرباں
جو گروہِ اہلِ کمال میں نہ شمارِ اہلِ ہُنر میں ہے



مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا
تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا

گو ستم نے تیرے ہر اک طرح مجھے نا امید بنا دیا
یہ میری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کر کے دکھا دیا

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا

تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں
تیرے گیسوؤں کو سنوار کر تجھے آئینہ بھی دکھا دیا

میری شاعری میں تیرے سوا کوئی ماجرا ہے نہ مدعا
جو تیری نظر کا فسانہ تھا وہ میری غزل نے سنا دیا

یہ غریب عاجزِ بے وطن یہ غبارِ خاطرِ انجمن
یہ خراب جس کے لئے ہوا اُسی بے وفا نے بھلا دیا



یہ ہنسی خوشی کا موسم یہ بہار کا زمانہ
ترے واسطے حقیقت مرے واسطے فسانہ

نہ سنبھل سکے گی تجھ سے تری زلف تا بہ شانہ
میں ابھی سے دیکھتا ہوں جو دکھائے گا زمانہ

جو تری زباں سے نکلا وہی بن گیا فسانہ
مرے دل کی دھڑکنوں سے رہا بے خبر زمانہ

مری خانماں خرابی کا جہاں میں ہے فسانہ
یہ وہ حادثہ ہے جس کو نہ بھلا سکا زمانہ

میں نگاہِ باغباں میں کوئی اور ہو گیا ہوں
ابھی چار دن ہوئے ہیں کہ جلا ہے آشیانہ

تجھے اے غمِ محبت اِدھر آ گلے لگا لوں
نہ ترا کہیں گذر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

میں ہوں وہ غریب عاجزؔ کہ گلوں کی انجمن میں
مرے پیرہن کے ٹکڑوں کا بنا ہے شامیانہ



سب فصلِ بہاری کے سائے میں پلے ساقی — اک ہم ہیں کہ گلشن میں پھولے نہ پھلے ساقی

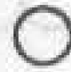
جب رِند صراحی سے ملتے ہوں گلے ساقی — ہم تشنہ لبوں کا بھی کچھ ذکر چلے ساقی

یادِ شہدا میں بھی اِک شمع جلے ساقی — جب شام گذر جائے جب رات ڈھلے ساقی

وہ شیشے وہ پیمانے جو زینتِ محفل تھے — کچھ ٹوٹ چکے ساقی کچھ ٹوٹ چلے ساقی

ایسا کسی محفل میں اندھیر نہیں دیکھا

شمشیر تو چل جائے ساغر نہ چلے ساقی



بلا سے ہم تری محفل سے اشکبار چلے
تو خوش تو ہے کہ ترے دل کا بوجھ اُتار چلے

وفا پرست مبارک ہو سوئے دار چلے
ستم کا چلتا تھا جس طرح کاروبار۔ چلے

کہاں تک اب مئے و مینا کے منتظر بیٹھیں
یہ کہدو پیرِ مغاں سے کہ بادہ خوار چلے

دعا گزارِ چمن کچھ قفس نصیب بھی ہیں
ذرا اِدھر سے بھی ہوتی ہوئی بہار چلے

چمن میں لائے تھے دامانِ آرزو عاجزؔ
چمن سے لے کے گریبانِ تار تار چلے



یہ آنسو بے سبب جاری نہیں ہے
مجھے رونے کی بیماری نہیں ہے

نہ پوچھو زخمہائے دل کا عالم
چمن میں ایسی گُل کاری نہیں ہے

بہت دُشوار سمجھانا ہے غم کا
سمجھ لینے میں دُشواری نہیں ہے

غزل ہی گنگنانے دو کہ مجھ کو
مزاجِ تلخ گفتاری نہیں ہے

چمن میں کیوں چلوں کانٹوں سے بچ کر
یہ آئینِ وفاداری نہیں ہے

وہ آئیں قتل کو جس روز چاہیں
یہاں کس روز تیاری نہیں ہے



میرے لئے قیدِ سحر و شام نہیں ہے
جلتا ہوں کہ جلنے کے سوا کام نہیں ہے

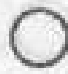
اس دَور میں ارزاں مئے گلفام نہیں ہے
پینے کی اجازت ہے مگر عام نہیں ہے

پوری نہ ہوئی راحتِ منزل کی تمنّا
ہم جیسے مسافر کے لئے شام نہیں ہے

بخشی ہے تری اِک نگہِ خاص نے مجھکو
وہ درد کی دولت جو بہت عام نہیں ہے

مر کر بھی دکھا دینگے ترے چاہنے والے
مرنا کوئی جینے سے بڑا کام نہیں ہے

دُنیا میں بُرے ہم سے زیادہ بھی ہیں عاجزؔ
ہاں ہم سے زیادہ کوئی بدنام نہیں ہے



ہم ہیں بکھرے ہوئے جلووں کو سجانے والے
گیسوؤں والوں سے کچھ کم نہیں شانے والے

ترک ہم رسم و رہِ عام جو کر بیٹھے ہیں
اُنگلیاں ہم پہ اُٹھاتے ہیں زمانے والے

ایک دیوانہ بنا فصلِ بہاراں میں اگر
سینکڑوں بن گئے زنجیر بنانے والے

رسن و دار نہیں اہلِ جنوں کی منزل
ہم مسافر ہیں بہت دُور کے جانے والے

کس سے دُہرائیں فسانہ غمِ دل کا عاجزؔ
سُننے والوں سے زیادہ ہیں سُنانے والے



جہاں غم ملا اُٹھایا پھر اُسے غزل میں ڈھالا
یہی دردِ سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا

تیرے ہاتھ سے ملی ہے مجھے آنسوؤں کی مالا
تری زلف ہو دوگونہ ترا حُسن ہو دوبالا

میں ہرے بھرے چمن میں وہ شکستہ شاخِ گُل ہوں
نہ خزاں نے جسکو تھاما نہ بہار نے سنبھالا

مرے غم کی قدر و قیمت کوئی میرے دل سے پوچھے
یہ چراغ وہ ہے جس سے مرے گھر میں ہے اُجالا

جہاں حُسن و عشق ہونگے یہی دھوپ چھاؤں ہوگی
کبھی تیری بات اُونچی کبھی میرا بول بالا

تجھے انجمن مُبارک مجھے فکر و فن مُبارک
یہی میرا تختِ زرّیں یہی میری مرگ چھالا



ترے عارضوں کو سُرخی تری زلف کو شکن دی
ترے حُسن کا سبب ہے میرا ذوقِ خوش پسندی

میں ہوں جس نے رنگ و نکہت کی خبر چمن چمن دی
کہیں انجمن سجائی کہیں شمع انجمن دی

مرے دل کو ہے جنوں سے بڑی اعتقاد مندی
ترے رُوبرُو اسی نے مجھے جراَتِ سخن دی

ترا التفات ہو یا تیرا وعدۂ کرم ہو
وہ ستم کا پیش خیمہ یہ جفا کی پیش بندی

یہ ہے میری وضع داری کہ نباہ کر رہا ہوں
تجھے عادتِ تغافل مجھے خوئے دردمندی

مجھے موسمِ بہاراں سے رہے گی یہ شکایت
کہ وہ مستحق نہیں تھا جسے دولتِ چمن دی

ترے لب پہ شکوۂ غم تجھے کیا ہوا ہے عاجزؔ
کہاں دعوئے محبت کہاں عافیت پسندی ؟



غم اور بھی گرچہ اے غمِ یار بہت ہیں
اب بھی تری زلفوں کے گرفتار بہت ہیں

دو دن بھی نہ گزرے ہیں کہ گزری ہے قیامت
پھر منتظرِ شوخیٔ رفتار بہت ہیں

اِک گُل بھی ہمارے لئے گلشن میں نہیں ہے
دامن سے اُلجھنے کے لئے خار بہت ہیں

ہم سا کوئی پابندِ وفا بھی نہیں ہوگا
ہر چند کہ ہم لوگ گنہگار بہت ہیں

اشکوں کا نہ ہونا تو کوئی بات نہیں ہے
غم کے لئے پیرایۂ اظہار بہت ہیں

ہم لوگ غمِ عشق کے مُنکر نہیں لیکن
اِس غم کے علاوہ بھی تو آزار بہت ہیں



اب کون ہمیں سمجھے اب کون ہمیں جانے
جب پھاڑ چکے دامن جب ہو چکے دیوانے

سب آپ کے اپنے ہیں میرے لئے بیگانے
خُم ہوں کہ مئے و مینا شیشے ہوں کہ پیمانے

کیا ہوگا محبت کا انجام خدا جانے
تم عشق کے دشمن ہو ہم حُسن کے دیوانے

اِس فصلِ بہاری میں دل ٹوٹ گئے جتنے
اتنے کسی موسم میں ٹوٹے نہیں پیمانے



جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے
بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

نہ پوچھو مرے دیدہ و دل کا عالم
گھٹا جیسے اُمڈے سبو جیسے چھلکے

مقدر نے چھنوائی ہے خاک ورنہ
کبھی ہم بھی تھے رہنے والے محل کے

کہاں تک الجھی جائے گی کون جانے
تری زلف و رخسار سے بات چل کے

بہت ٹھوکریں لگ رہی ہیں گلوں کو
سنبھل کے اے بادِ بہاری سنبھل کے



تنگ آ کے روز روز کے اصرار سے چلے
لو ہم تمھارے سایۂ دیوار سے چلے

گُلکاریوں سے باز نہ آئے جنوں کی ہم
جس راہ پر چلے اسی رفتار سے چلے

اہلِ خرد بھی ساتھ ہمارے چلے، مگر
بچ بچ کے سرحدِ رسن و دار سے چلے

ایسا بھی کوئی قافلہ دیکھا ہے آپ نے؟
جو موسمِ بہار میں گلزار سے چلے

اُس کام کے لئے وہ کریں اہتمام کیوں
جو کام اُن کی شوخیٔ رفتار سے چلے



میخانے میں قحطِ مے گلفام پڑا ہے
شیشہ کہیں پھینکا ہے کہیں جام پڑا ہے

اس ناز کے قربان اس انداز کے صدقے
گھر بیٹھے ہو اور شہر میں کہرام پڑا ہے

تم صاحبِ دستار و قبا جب سے ہوئے ہو
دیوانہ اُسی دن سے مرا نام پڑا ہے

سمجھے ہے محبّت کو نہ مانے ہے وفا کو
کس آفتِ جاں سے بخدا کام پڑا ہے

عاجزؔ کہ جسے چین نہ تھا بسترِ گل پر
اب چھوڑ کے سب راحت و آرام پڑا ہے



عقل کی دوستی سے کنارا کرے
حوصلہ ہو تو کہنا ہمارا کرے

عشق میں موت کا نام ہے زندگی
جس کو جینا ہو مرنا گوارا کرے

اِس سے بڑھ کر کوئی رہنما ہی نہیں
چل اُدھر جس طرف دل اشارا کرے

موج طوفاں سے ملنے چلا ہے جنُوں
عقل ساحل پہ بیٹھی نظارا کرے

آگے آگے زمانے کے ہم جائیں گے
راستہ وقت خالی ہمارا کرے

چین کی نیند غافل نہ کردے ہمیں
درد اُٹھ۔ اُٹھ کے دل کو پکارا کرے

ماہ انجم مُبارک تجھے اے فلک
کون اِن ٹھیکروں پہ گزارا کرے

فکر و فن میرا دنیا کو آئینہ ہے
اپنی زلفیں اِسی میں سنوارا کرے



نہ پوچھ شوق پہ کس کشمکش کا عالم ہے
کہ آرزوئیں زیادہ ہیں زندگی کم ہے

جگر کے زخم ہمیشہ کھِلے ہی رہتے ہیں
نہ کوئی وقت ہے ان کے لئے نہ موسم ہے

وہ اور ہیں جنھیں برسات کی تمنا ہے
یہاں تو آنسوؤں کی رات دن جھما جھم ہے

وہی سمجھتے ہیں مجھکو جو مجھکو سُنتے ہیں
مری غزل میں مری زندگی مجسّم ہے

غزل جو حضرت عاجزؔ سُنایا کرتے ہیں
وہ شاعری تو نہیں شاعری کا ماتم ہے



مجھ پہ جو کچھ گذر گئی اُس کا تو غم ذرا نہ کر
آنکھوں میں اپنی سُرمہ دے زلفوں میں اپنی شانہ کر

میرے لئے نہ کوئی غم اے ستمِ زمانہ کر
میں تو خراب ہو چکا اپنا کہیں ٹھکانہ کر

مجھ کو تو فصلِ گُل یہی شغل سپرد کر گئی
صحنِ چمن کی خاک اُڑا ماتمِ آشیانہ کر

لالہ و گُل پہ باغباں تہمتِ سرکشی نہ رکھ
میں ہوں چمن کا رازداں مجھ سے نہ یہ بہانہ کر

درد سے اے دلِ حزیں ضبط کی تاب اب نہیں
آہوں کی راہ کھول دے آنسوؤں کو روانہ کر



رائیگاں سب فصلِ گُل کی گلشن آرائی گئی
اور اُلجھی جس قدر یہ زُلف سُلجھائی گئی

انجمن کی انجمن بن کر تماشائی گئی
تیرے دیوانے کو جب زنجیر پہنائی گئی

وہ جہاں پہونچے وہاں تک میری رُسوائی گئی
بات خود پھیلی نہیں ہے بلکہ پھیلائی گئی

گرچہ میں خاموش تھا لیکن زبانِ اشک سے
بارہا دل کی کہانی اُن سے دہرائی گئی

جان دینا ہی پڑی شرحِ وفا کے واسطے
بات نازک تھی بڑی مشکل سے سمجھائی گئی

آنکھ میں آنسو تبسم لب پہ تھا احباب کے
جب خوشی کی لے میں غم کی راگنی گائی گئی



کوئی محفل ہے نہ کوئی انجمن میرے لئے
وادیٔ غربت سے کیا کم ہے وطن میرے لئے

میں اسیرِ حلقۂ دامِ وفا ہو ہی چکا
اب نہ ڈالو اپنی زلفوں میں شکن میرے لئے

باغباں تقسیم یوں کرتا ہے انعامِ بہار
پھول اپنے واسطے خارِ چمن میرے لئے

میرا گلشن سے نکلنا حادثہ کچھ کم نہ تھا
چاک کر ڈالے گلوں نے پیرہن میرے لئے

پیشوائی کو نہیں، بہرِ تماشا ہی سہی
اُٹھ تو جاتی ہے نگاہِ انجمن میرے لئے

کس قدر کل تک رہی اہلِ وفا سے بے نیاز
آج کیوں روتی ہے شمعِ انجمن میرے لئے

ہوشیاروں کے لئے کچھ بات کر لیتا ہوں میں
ورنہ کافی تھا مرا دیوانہ پن میرے لئے



اب کسی کو ہم غریبوں کا خیال آتا نہیں
مدّتیں گذریں کوئی پُرسانِ حال آتا نہیں

دوستوں سے بھی محبت دشمنوں سے بھی وفا
ہم کو اس کے ماسوا کوئی کمال آتا نہیں

خشک ہو جاتے ہیں جب آنسو تو آتا ہے لہو
غم وہ دولت ہے کبھی جس پر زوال آتا نہیں

ہم فقیروں کے یہاں بٹتی ہے خیراتِ وفا
کون پھیلائے ہوئے دستِ سوال آتا نہیں؟

اُن کے گلشن سے کبھی جاتی نہیں فصلِ بہار
اور یہاں پھولوں کا موسم کوئی سال آتا نہیں

ہم تو اس دَورِ جفا میں بھی ہیں اتنے وضعدار
خواب میں بھی بے وفائی کا خیال آتا نہیں

کیسے کیسے سُرخ رُو آتے ہیں تیری بزم میں
ہاں مرے جیسا کوئی آشفتہ حال آتا نہیں



وہ محفل جو اپنی سجائی ہوئی تھی گذر اَب وہاں بھی ہمارا نہیں ہے

کبھی گُل ہمارے گُلستاں ہمارا، کبھی آشیاں بھی ہمارا نہیں ہے

کہیں سوزشِ دل کی روداد کس کو سنائیں تپِ غم کی فریاد کس کو

بجز شمعِ محفل تری انجمن میں کوئی ہم زباں بھی ہمارا نہیں ہے

محبت تو ہے اپنی فطرت میں داخل کئے جا رہے ہیں کئے جائینگے ہم

مگر آپ قدرِ محبت کرینگے یہ وہم و گماں بھی ہمارا نہیں ہے

بھٹکتے ہیں یوں بے سہارے کہ جیسے مسافر بھٹکتا ہے تاریکیوں میں

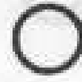
کوئی شمع منزل ہماری نہیں ہے کوئی کارواں بھی ہمارا نہیں ہے

یہی بے نیازی یہی بے رُخی ہے تو ہم سے بھی دُشوار اَب بندگی ہے

اگر تیری محفل ہماری نہیں ہے ترا آستاں بھی ہمارا نہیں ہے

بھرم اپنے نالوں کا رکھیں گے کب تک کسی کے تغافل کو الزام دیکر

حقیقت تو یہ ہے کہ اے ہمصفیرو ! وہ جوشِ فغاں بھی ہمارا نہیں ہے



حرم والے یا دَیر والے ہوئے
ہیں سب ایک سانچے میں ڈھالے ہوئے

ستم ہے کہ میرے اُچھالے ہوئے
مجھی کو بُرا کہنے والے ہوئے

وہی آج ساقی کے ہاتھوں میں ہیں
جو ساغر تھے میرے اُچھالے ہوئے

نہ آئے خرد کے جو معیار پر
وہ دار و رسن کے حوالے ہوئے

بُتوں سے جو منسوب ہیں شعبدے
وہ ہیں برہمن کے نکالے ہوئے

ہمیں اِس ہوس کے زمانے میں ہیں
محبّت کی دُنیا سنبھالے ہوئے



یہی بیکسی تھی تمام شب اِسی بیکسی میں سحر ہوئی ۔۔۔ نہ کبھی چمن میں گذر ہوا نہ کبھی گلوں میں بسر ہوئی

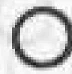
یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی ۔۔۔ مرے آشیاں سے دُھواں اُٹھا تو مجھے بھی اسکی خبر ہوئی

مجھے کیا اگر ترے دوش سے تری زلف تا بکمر ہوئی ۔۔۔ کہ میں ایسا خانہ خراب ہوں کبھی چھاؤں میں بسر ہوئی

تجھے فخر اپنے ستم پہ ہے کہ عصائے راہ نما بنا ۔۔۔ مجھے ناز اپنی وفا پہ ہے کہ چراغِ راہگذر ہوئی

میں تری بلا سے اُجڑ گیا ترا حوصلہ تو نکل گیا

یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ یہ عید بھی ترے گھر ہوئی



میکدہ بند ہے دَور چلتا نہیں
دیکھیں کب تک یہ موسم بدلتا نہیں

کام اپنی وفا سے نکلتا نہیں
اب یہ سکّہ زمانے میں چلتا نہیں

جس پہ گرتے ہیں پروانۂ آرزو
وہ چراغ اُن کی محفل میں جلتا نہیں

اِک زمانہ ہوا فصلِ گُل آچکی
دیدہ و دل سے کانٹا نکلتا نہیں

وہ ہمیں وضعداری سکھانے چلے
جن سے اپنا ہی دامن سنبھلتا نہیں



قائم ہے سُرورِ مئے گلفام ہمارا ۔۔۔ کیا غم ہے اگر ٹوٹ گیا جام ہمارا

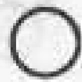
اتنا بھی کسی دوست کا دشمن نہ ہو کوئی ۔۔۔ تکلیف ہے اُن کے لئے آرام ہمارا

پھولوں سے محبت ہے تقاضائے طبیعت ۔۔۔ کانٹوں سے اُلجھنا تو نہیں کام ہمارا

بھولے سے کوئی نام وفا کا نہیں لیتا ۔۔۔ دُنیا کو ابھی یاد ہے انجام ہمارا

غیر آکے بنے ہیں سبب رونقِ محفل ۔۔۔ اب آپ کی محفل میں ہے کیا کام ہمارا

موسم کے بدلتے ہی بدل جاتی ہیں آنکھیں
یارانِ چمن بھول گئے نام ہمارا

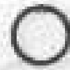


زلف جو آج تا بہ شانہ ہے　　کل کہاں ہو گی کیا ٹھکانہ ہے

شام بھی آنسو صبح بھی آنسو　　کیا یہی گردشِ زمانہ ہے

ہم ہی شکوہ ترا نہیں کرتے　　اب تو گھر گھر یہی فسانہ ہے

میری وحشت کا ہے سبب کچھ اور
موسمِ گُل تو اِک بہانہ ہے



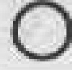
کچھ سجے ہیں زلف میں کچھ گلوئے یار میں
پھول جس قدر کھلے موسمِ بہار میں

ہم رہے تو کیا رہے ہم ہیں کس شمار میں
قافلے کا قافلہ لُٹ گیا بہار میں

جی میں ہے کہ روئیے شاخِ سایہ دار میں
دونوں ہاتھ ڈال کے گردنِ بہار میں

دو ہی سلسلے تو ہیں میری سرگذشت کے
اِک کڑی خزاں میں ہے دوسری بہار میں

دامنِ چمن تو ہے دُور کا معاملہ
اپنا پیرہن نہیں اپنے اختیار میں



رنگ آنسوؤں کا میرے جس دن سے شہابی ہے
صبح اُن کی بسنتی ہے شام اُن کی گلابی ہے

میخانے سے باہر تک جھنکار چلی آئی
یہ کس کا سبُو ٹوٹا یہ کون شرابی ہے؟

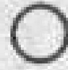
بے کیفیٔ صہبا میں ساقی کی خطا نکلی
ہم نے تو یہ سمجھا تھا موسم کی خرابی ہے

کیفیتِ غم پوچھو ہم اہلِ طبیعت سے
مے ہوگی اُسی گھر میں جس گھر میں گلابی ہے

آسان ہے اب کتنی رسم و رہِ میخانہ
دو گھونٹ بھی پی لی ہے جس نے وہ شرابی ہے

اُنکے متعلق جو باتیں ہیں مرے دل میں
چُپ رہئے تو بیجا ہے کہئے تو خرابی ہے





دِن مِرا ساز بنے رات غزل بن جائے ۔۔۔ میرا مجموعۂ حالات غزل بن جائے

اپنی پلکوں کے ستارے جو میں شامل کر دوں ۔۔۔ رِم جھماتی ہوئی برسات غزل بن جائے

حُسنِ تنظیم ہو ساقی کا مِرا حُسنِ خیال ۔۔۔ پھر تو یہ بزمِ خرابات غزل بن جائے

عشق کے ہاتھ کی مٹی بھی ہے سونا اے دوست ۔۔۔ میں جو بھیجوں وہی سوغات غزل بن جائے

قصۂ دار و رسن ہو کہ بیانِ قدوزلف

میں ہوں شاعر مری ہر بات غزل بن جائے



ہنسیں گے مجھ پر وہی کہ جن کو شعورِ حالِ چمن نہیں ہے
میں چاک دامن جو پھر رہا ہوں یہ میرا دیوانہ پن نہیں ہے

خموش میں اس لئے نہیں ہوں کہ دولتِ فکر و فن نہیں ہے
بہت سخنہائے گفتنی ہیں مگر مجالِ سخن نہیں ہے

ہے مشورہ دوستوں کو میرا کہ کم نہ ہو گرمیٔ تمنّا
چراغ خلوت ہی میں جلاؤ اگر کوئی انجمن نہیں ہے

زمانہ آنے تو دو جنوں کا ضرور کچھ دھجیاں اُڑیں گی
قبائے رنگیں تو ہے کسی کی اگر مرا پیرہن نہیں ہے

ستم ہے، اہلِ حرم ابھی تک مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں؟
وہ شیخ اس دور میں کہاں ہے جو بندۂ برہمن نہیں ہے

غزل جو سنتا ہے میری عاجزؔ وہ مجھکو حیرت سے دیکھتا ہے
کہ دل پہ گذری ہے کیا قیامت مگر جبیں پر شکن نہیں ہے



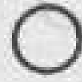
کچھ حال نہ پوچھو عاجز کا کمبخت عجب دیوانہ ہے
ہنستا ہے تو ہنستے رہنا ہے رونا ہے تو روتے جانا ہے

نغموں کی ہر اک جا شہرت ہے نالوں کا تمام افسانہ ہے
جس باغ میں ہم جا پہونچے ہیں پھولوں نے ہمیں پہچانا ہے

سنتے ہیں وفا کے رستے میں منزل نہ مسافر خانہ ہے؟
کیا جانے کہاں تک پہونچے ہیں کیا جانے کہاں تک جانا ہے

زنجیر جنوں کا تحفہ ہے، زنجیر سے کیا گھبرانا ہے
ہم ہاتھ بڑھائے بیٹھے ہیں پہنائے جسے پہنانا ہے

پہلو میں ہمارے دل کیسا دل پر تو قیامت بیت گئی
مرجھایا ہوا اک غنچہ ہے ٹوٹا ہوا اک پیمانہ ہے



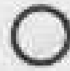
لالہ و گُل کی تمنّا کر کے ہم
بیٹھے ہیں اشکوں سے دامن بھر کے ہم

اِس چمن میں کیا یہی دستور ہے
پھُول کے تم مُستحق پتھّر کے ہم

اب تو کوئی پوچھنے والا نہیں
تھے کبھی چشم و چراغ اِس گھر کے ہم

ایک دن مرنا تو ہے سب کو مگر
جی رہے ہیں رات دن مر مر کے ہم

اتنا رُسوا کوئی دشمن بھی نہیں
جتنے رُسوا ہیں محبّت کر کے ہم



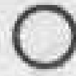
ہمارے ہونٹوں تک آئے ترانہ! مشکل ہے
یہ وہ چمن ہے جہاں مُسکرانا مشکل ہے

نہ پوچھ کس لئے آنکھوں میں آگئے آنسو
سبب ضرور ہے لیکن بتانا مشکل ہے

بہار میں بھی گُلستاں کا کیا کہوں احوال
ہیں اتنے کانٹے کہ دامن بچانا مشکل ہے

گدازِ شمع یہاں ہے نہ سوزِ پروانہ
اِس انجمن میں ہمارا ٹھکانا مشکل ہے

غمِ حیات کا مارا ہوا ہے دل اے دوست
غزل تو ہوگی مگر عاشقانہ! مشکل ہے



وہی زندہ رہنے کا فن جانتے ہیں
جو آدابِ دار و رسن جانتے ہیں

بہار اِنکو کس درجہ مہنگی پڑی ہے
گُل و لالہ و نسترن جانتے ہیں

حقیقت فراموش ہم کو نہ سمجھو
کہاں چاک ہے پیرہن جانتے ہیں

پریشانیاں میری مجھ سے زیادہ
ترے گیسوئے پرشکن جانتے ہیں

خرد کھیل سمجھی ہے دیوانہ پن کو
جو کرتے ہیں دیوانہ پن جانتے ہیں

عجب درد ہے دردِ بے خانمائی
ہم آوارگانِ وطن جانتے ہیں

چراغِ سرِ رہگذر ہم کو سمجھو
نہ منزل نہ ہم انجمن جانتے ہیں



اب کے جو بہار آئی بے بادہ و جام آئی
اِک بوند بھی مے اب تک صبح آئی نہ شام آئی

کس پیاس کے مارے کو یادِ مئے و جام آئی
بھیگی ہوئی اشکوں سے میخانے کی شام آئی

جلتا ہے چراغوں میں خوں تیرے شہیدوں کا
ہولی کی بچی دولت دیوالی میں کام آئی

دیوانے کے قدموں میں جھکنا پڑا دنیا کو
جب وقتِ جنوں آیا کچھ عقل نہ کام آئی

میرے حرمِ فن میں لیلائے غزل عاجزؔ
نشتر بقلم آئی آتش بکلام آئی



دوست ہیں آشفتہ گوئی کو غزل جانے ہوئے
شاعروں میں ہو گئے ہم جب سے دیوانے ہوئے

عقل کے جتنے کرشمے تھے سب افسانے ہوئے
ہم تو ہیں اے عشق تجھ کو پیشوا مانے ہوئے

اب نگاہِ شیخ ملتی ہے نہ چشمِ برہمن
بھر گئے دیر و حرم خالی جو میخانے ہوئے

دیکھیں اب کے امتحاں میں سرخرو ہوتا ہے کون
وہ بھی کچھ سوچے ہوئے ہیں ہم بھی کچھ ٹھانے ہوئے

تو نے پھر شاید پکارا ہے فرازِ دار سے
اے جنوں ہم ہیں تری آواز پہچانے ہوئے

بوالہوس محلوں میں ہیں بیخواب اور تیرے فقیر
سو رہے ہیں چادرِ آسودگی تانے ہوئے

فصلِ گل عاجز قفس میں آتے ہی آتے رہی
ہم یہاں بیٹھے تھے کیا کیا منتیں مانے ہوئے



اب تو اشکوں کی جھڑی دن رات ہے
ہم کو ہر موسم بھری برسات ہے

روز اِک تحفہ ہے اِک سوغات ہے
اے غمِ دوراں تری کیا بات ہے

زلفِ جاناں کی سیاہی مات ہے
اللہ اللہ کیا اندھیری رات ہے

اُن کی آنکھوں کا اشارا ہی نہیں
ورنہ مرجانا بھی کوئی بات ہے؟

کچھ نہیں رکھتے محبّت کے سوا
ہم غریبوں کی یہی اوقات ہے

جھومتے ہیں سب مرے اشعار پر
میرے دل میں سب کے دل کی بات ہے



ہم کو زنجیر پہننے میں کوئی عار نہیں
یوں بھی دیوانہ ہی سب کہتے ہیں ہشیار نہیں

قید خانے کی بظاہر کوئی دیوار نہیں
ہم گرفتار ہیں ایسے کہ گرفتار نہیں

پھونک ڈالا ہے گلستاں کا گلستاں جس نے
کون کہتا ہے تمہا شعلۂ رخسار نہیں

غم کے بازار میں اشکوں کی بڑی آمد ہے
ایک قطرے کا مگر کوئی خریدار نہیں

ایسی حالت میں بھی دل ہے کہ جئے جاتا ہے
کون سا درد نہیں کون سا آزار نہیں

کروٹیں لیتی ہیں سینے میں کچھ ایسی باتیں
جن کے سننے کو زمانہ ابھی تیار نہیں

بات کہنے کا یہ انداز ہے مشکل عاجز
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں



کتنا دُکھ کتنی جفا کتنا ستم دیکھا ہے
ہم نے اِس عمر میں اِک عُمر کا غم دیکھا ہے

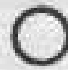
زلف بل کھائی نہ تھی تا بہ کمر آئی نہ تھی
وہ زمانہ بھی ترے سر کی قسم دیکھا ہے

ایک مدّت سے مری صبحِ مسرت گم ہے
تو نے رستے میں کہیں اے شبِ غم دیکھا ہے؟

زخمِ دل مانگتے ہیں اور دُعا دیتے ہیں
ہم سا سائل کوئی اے اہلِ کرم دیکھا ہے؟

دیکھئے میری غزل میں کبھی صورت اپنی
یہ وہ آئینہ ہے جو آپ نے کم دیکھا ہے

کیسے سمجھے کوئی دُکھ درد ہمارا عاجزؔ
ہم نے جو دیکھا ہے اوروں نے وہ غم دیکھا ہے؟



دردمندِ عشق ہیں غم سے نہ گھبرائینگے ہم
شاعری کرتے رہینگے اور مرجائینگے ہم

ہم تو دیوانے ہیں ہم کو مصلحت سے کیا غرض
اپنی چادر سے بھی باہر پاؤں پھیلائینگے ہم

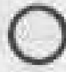
عشق کی بربادیاں قسمت سے ہوتی ہیں نصیب
جس قدر بگڑیں گے اتنا ہی سنور جائینگے ہم

ہوشیاروں کو مبارک تیری محفل اے خرد
صبح آئیں گے ترے در پر نہ شام آئینگے ہم

اپنے آنسو ہی جواب پرسشِ احوال ہیں
خود نہیں سمجھے تو کیا اوروں کو سمجھائینگے ہم

اب کے پھر برسات میں گنجِ شہیداں پر چلیں

آسماں روئے گا اور اپنی غزل گائینگے ہم



اے پیرِ مغاں تشنہ لبی عام بہت ہے
تو نے تو کہا تھا مئے گلفام بہت ہے

ساون کی گھٹا آ گئی میخانے کے نزدیک
ہونٹوں سے مگر فاصلۂ جام بہت ہے

خلوت میں غریبوں کی اُجالا نہیں دیکھا
محفل میں تو اے شمع ترا نام بہت ہے

غم ہے تو کوئی لطف نہیں بسترِ گُل پر
جی خوش ہے تو کانٹوں پہ بھی آرام بہت ہے

جلتا ہے چراغوں میں لہُو اہلِ وفا کا
سُنتے ہیں کہ رنگین تری شام بہت ہے

ہنسنے کا تو موقع نہیں۔ آ، بیٹھ کے رو لیں
یہ فرصتِ غم بھی دلِ ناکام بہت ہے

عاجزؔ ہوسِ جشنِ چراغاں نہیں ہم کو
اِک شمع ہی جل جائے سرِ شام بہت ہے



کیا حال بیاں کیجے سب حال ہے آئینہ　　اشکوں سے بھرا دامن زخموں سے بھرا سینہ

یہ فصلِ گل و لالہ گذری چلی جاتی ہے　　بے شیشہ و بے ساغر بے بادہ و بے مینا

وہ انجمن آرائی یہ غربت و تنہائی　　بخشا تو بہت بخشا چھینا تو بہت چھینا

دُنیا میں غریبوں کو دو کام ہی آتے ہیں　　جینے کے لئے مرنا، مرنے کے لئے جینا

سُنتے ہیں کہ اب جو بھی پیتا ہے بہکتا ہے　　ہم تک ہی رہا قائم آدابِ مے و مینا

اِس دور میں اے عاجز کیا ذکر محبت کا

اِک دفترِ گُم گشتہ　اِک قصۂ پارینہ



یوں تو ملنے کو بہت پیر و جواں ملتے ہیں
جو محبت سے ملیں ایسے کہاں ملتے ہیں

ڈھونڈھنے والوں کو ہم بھی وہیں مل جائینگے
اُن کی زلفوں کے گرفتار جہاں ملتے ہیں

پھول اشکوں کے جو ملتے ہیں مرے دامن میں
ایسے گل صحنِ گلستاں میں کہاں ملتے ہیں

اب تو یہ حال زمانے کا ہے اللہ اللہ
دوست بھی ملتے ہیں تو دشمنِ جاں ملتے ہیں

بے مشقت کبھی آرام نہیں ملتا ہے
گُل بھی ملتے ہیں تو کانٹوں میں نہاں ملتے ہیں

یاد آجاتی ہے اربابِ وطن کی عاجزؔ
غم کے مارے ہوئے دو چار جہاں ملتے ہیں



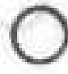
کس درجہ گراں بادۂ گلفام لیا ہے
سو جام دیئے ہیں اگر اک جام لیا ہے

غربت میں وطن کا جو کبھی نام لیا ہے
وہ چوٹ لگی ہے کہ جگر تھام لیا ہے

کانٹوں کا زمانہ ہو کہ پھولوں کا ہو موسم
ہم نے کسی کروٹ بھی نہ آرام لیا ہے

دُنیا انہیں بیکار سمجھتی ہے تو سمجھے
ہم نے تو اِن اشکوں سے بڑا کام لیا ہے

احسان ہے دل پر ترا اے دردِ محبت
تو نے مِرا گرتا ہوا گھر تھام لیا ہے



آج جیسی بنی کل اس سے جُدا گانہ بنے ایک زنجیر ہمارے لئے روزانہ بنے

ہم تو محفل سے نکالے گئے دیوانہ بنے کون اب آپ کی زلفوں کے لئے شانہ بنے

منصبِ ساقی گری بھی ہے ولایت کا مقام صاحبِ دل بنے تب صاحبِ میخانہ بنے

سخت دُشوار ہے پابندیٔ آدابِ جنوں جس کو بننا ہو سمجھ بُوجھ کے دیوانہ بنے

زندگی کام کی بنتی نہیں بے سوزِ جگر شمع بننے کی تمنّا ہو تو پروانہ بنے

پیرہن سُرخ نہیں ہے تو کفن سُرخ سہی

کوئی جوڑا تو گدا کے لئے شاہانہ بنے !



وہی کہیں گے جو ہوگا ہمیں بجا معلوم
بھلا کسی کو ہو معلوم یا بُرا معلوم

اُلجھ کے پیچ و خمِ روزگار میں دیکھا
تری ہی زلف کا ہوتا ہے سِلسِلہ معلوم

زباں سے حضرتِ ناصح کو کیا بتائیں ہم
یہ دل کی چوٹ ہے کھائے تو ہو مزا معلوم

ہے اور کون جو پھولوں کو روندتا گذرے؟
مجھے تو ہوتا ہے اُن کا ہی نقشِ پا معلوم

نِکل کے انجمنِ عشق سے کہاں جاؤں؟
مجھے تو ہے بس اسی گھر کا راستہ معلوم

اِدھر آ، اے غمِ دوراں! کہ اِس زمانے میں
تو ہی تو ہوتا ہے اِک صورت آشنا معلوم



رونا آتا ہے تو آجاتے ہیں گانے کے لئے
ہم کو آساں ہے جو مشکل ہے زمانے کے لئے

اپنا دل سینۂ اشعار میں رکھ دیتے ہیں
کچھ حقیقت بھی ضروری ہے فسانے کے لئے

بیکسی ایسی بھی ہو جاتی ہے؟ اللہ اللہ
کوئی دشمن بھی نہیں دوست بنانے کے لئے

جان دینے کا ذریعہ تھی محبت پہلے
اَب تو اک کھیل ہے دُنیا کو دِکھانے کے لئے

اے جُنوں ان کی نہ کر فکر کہ ہُشیاروں کو
عقل ہی کافی ہے دیوانہ بنانے کے لئے

ہم کو شاعر نہ کہو ایک فقیر آیا ہے
دل کے دَروازے پہ آواز لگانے کے لئے



گرچہ ہیں گردشِ تقدیر کے مارے ہوئے ہم
شکر اس کا ہے کہ ہمت نہیں ہارے ہوئے ہم

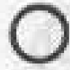
نظر آتا نہیں پہچاننے والا کوئی
اجنبی شہر میں اے دوست تمھارے ہوئے ہم

گرچہ دُنیا نے کیا بے سر و ساماں ہم کو
اپنے نغموں سے ہیں دُنیا کو سنوارے ہوئے ہم

غم پہ اس واسطے بُنیادِ سخن رکھی ہے
تم سے نزدیک اسی غم کے سہارے ہوئے ہم

عقل کیا کہنا تری انجمن آرائی کا
کیا کہیں کیوں تیری محفل سے کنارے ہوئے ہم

رسم و آدابِ محبّت کوئی سیکھے ہم سے
زندگی ہیں اسی کوچے میں گذارے ہوئے ہم



تم تو بیدرد ہو بیتابیٔ غم کیا جانو　　اہل دل پہ جو گذرتے ہیں ستم کیا جانو

شمع کیوں جلتی ہے سرتا بقدم کیا جانو　　ہائے کیا چیز ہے مجبوریٔ غم کیا جانو

تم سے ناحق ہے مجھے چشمِ وفا کی اُمید　　تم بھلا شیوۂ اربابِ کرم کیا جانو

چند اشکوں سے اداحقِ بیاں کیا ہوگا　　کس قدر طول ہے افسانۂ غم کیا جانو

رسن و دار کو خاکِ کفِ پا بھی نہ ملا

کس جگہ اہلِ جنوں کا ہے قدم کیا جانو



جو سوز و ساز کا رکھتے رہے بھرم، نہ رہے
غزل کو کون سنبھالے کہ اہلِ غم نہ رہے

رہے تو دونوں چمن میں، مگر بہم نہ رہے
خزاں میں تم نہ رہے، فصلِ گُل میں ہم نہ رہے

کسی کا مجھ سے زیادہ نہیں ہے حق ساقی
مرے سبُو میں کسی کے سبُو سے کم نہ رہے

کوئی سلیقے سے دیکھے تو پی کے چلّو میں
وہ لُطف آئے کہ ارمانِ جامِ جم نہ رہے

نمودِ حُسن نہیں حُسن آشنا کے بغیر
جو تم رہے بھی تو کیا تم رہے کہ ہم نہ رہے

حیات کشمکشِ آرزو میں ہے اے دوست
وہ دن نہ آئے کہ زُلفوں میں پیچ و خم نہ رہے

عجیب لُطف ہے کروٹ بدلتے رہنے میں
خدا کرے کبھی اس دل میں درد کم نہ رہے

سُنا ہے رہتا ہے یاروں کا جمگھٹا عاجزؔ
ہزار حیف کہ اُس انجمن میں ہم نہ رہے



گونجتا ہے مرا نغمۂ فکر و فن
میکدہ میکدہ انجمن انجمن

فتوئے شیخ یا دعوئے برہمن
وہ بھی دیوانہ پن یہ بھی دیوانہ پن

تھک گیا عقل کی بخیہ کاری کا فن
چاک ہی چاک ہے پیرہن پیرہن

کوئی اہلِ جنوں کا نہیں ہم سخن
سب یہاں شیخ ہیں سب یہاں برہمن

لُٹ گیا آتے آتے قریبِ چمن
کاروانِ گُل و لالہ و نسترن

اَب سبھی ہیں مقاماتِ دار و رسن
دَیر ہو یا حرم، دشت ہو یا چمن

مجھ سے چاہیں تو اہلِ خرد مانگ لیں
تھوڑی آشفتگی تھوڑا دیوانہ پن

خُونِ عاجزؔ سے یوں سُرخ ہے وہ چھُری
جیسے ہاتھوں میں مہندی لگائے دُلھن



ہم چلے اب کاروبارِ آئینہ خانہ چلے
ہاں لگے آنکھوں میں سُرمہ زلف میں شانہ چلے

رسم جو چلتی رہی ہے بے حجابانہ چلے
مے نہیں تو آنسوؤں کا دور پیمانہ چلے

گر یہ چاہو ہو چھُری گردن پہ روزانہ چلے
چلیو تب اُس راستے پر جس پہ دیوانہ چلے

تشنہ کامو! گرم آہوں میں دھواں اٹھا تو ہو
اِک گھٹا کالی اُٹھے اور سوئے میخانہ چلے

وقت کو تیّار کرنا ہی پڑا خونیں کفن
وہ گدا ہم ہیں کہ خلعت لیکے شاہانہ چلے

ہر قدح آشام سے ممکن نہیں یہ اہتمام
بات ہُشیاری کی بولے چال مستانہ چلے

عقل کے پیچھے زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا
یوں چلا جائے ہے جیسے کوئی دیوانہ چلے

شمع و پروانہ میں کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں
ہم جو محفل سے سُنا کر اپنا افسانہ چلے



ہم کو تو بے سوال ملے بے طلب ملے — ہم وہ نہیں ہیں ساقی کہ جب مانگیں تب ملے

فریاد ہی میں عہدِ بہاراں گذر گیا — ایسے کھُلے کہ پھر نہ کبھی لب سے لب ملے

ہم یہ سمجھ رہے تھے ہمیں بدنصیب ہیں — دیکھا تو میکدے میں بہت تشنہ لب ملے

کس نے وفا کا ہم کو وفا سے دیا جواب؟ — اِس راستے میں لُوٹنے والے ہی سب ملے

ملتے ہیں سب کسی نہ کسی مدعا کے ساتھ — ارمان ہی رہا کہ کوئی بے سبب ملے

رکھا کہاں ہے عشق نے عاجزؔ کو ہوش میں
مت چھیڑیو اگر کہیں وہ بے ادب ملے





میں فقیرِ خانہ بدوش ہوں مرا انجمن میں گذر نہیں
نہ دکھاؤ خوابِ محل اُسے جسے جھونپڑے کی خبر نہیں

مرا درد کون سا درد ہے کہ قرارِ شام و سحر نہیں
مرے دشمنوں کو ہے سب پتہ میرے دوستوں کو خبر نہیں

مرے دردِ عشق کا ساتھ دے کسی بُوالہوس کا جگر نہیں
یہ تمام عمر کی راہ ہے گھڑی دو گھڑی کا سفر نہیں

مجھے عشق اگر نہ اُبھارتا تری زُلف کون سنوارتا
یہ ہُنر ہے میری نگاہ کا ترے آئینے کا ہُنر نہیں

تری داستاں کو بھی رنگ دوں ترے آستاں کو بھی رنگ دوں
مرے پاس خونِ جگر تو ہے مگر اتنا خونِ جگر نہیں



آنسوؤں کی مے، بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سینکڑوں میخانے اُجڑے ایک میخانہ بنا

ہوشیاروں کو نہیں معلوم رازِ فصلِ گُل
مجھ سے پوچھو میں اسی موسم میں دیوانہ بنا

شاخِ گُل کی چھاؤں میں گلچیں ہے اب آرام سے
دشمنِ خانہ ہی آخر صاحبِ خانہ بنا

بیچ میں کچھ جھونپڑے اہلِ محبّت کے بنے
اک طرف کعبہ بنا اک سمت بُتخانہ بنا

بے تامّل کود پڑتے ہیں وفا کی آگ میں
ہم ہیں اُس مٹّی سے جس مٹّی سے پروانہ بنا

میکشوں کی قدر کر ساقی کہ اِنکے واسطے
سنگ سے شیشہ بنا، شیشے سے پیمانہ بنا

ہم تو شاعر ہیں ہمارا درد چُھپ سکتا نہیں
جو غزل میں کہہ دیا ہم نے وہ افسانہ بنا



اس غریبی میں بھی چلتے ہیں سر اُونچا کر کے
ہم بھی اے دوست کلہدار ہیں اپنے گھر کے

دن بسر کر کے مشقت کی کڑی دھوپ میں ہم
رات کو سوتے ہیں ہاتھ اپنا سرہانے دھر کے

ایک چُلّو بھی نہ اپنے لئے باقی رکھّا
غیروں کو بخش دیئے ساغر و مینا بھر کے

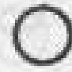
ہم کو با ایں ہمہ پہچان رہی ہے دُنیا
تاج گو اوروں کے سر پر ہیں ہمارے سر کے

تم نے دیکھی ہی نہیں ہمّتِ مردانِ وفا
زندگی ہے تو دِکھا دینگے کسی دن مر کے

تم تو مصروفِ چراغاں تھے تمھیں کیا معلوم؟
اس دیوالی میں دِیے بُجھ گئے کتنے گھر کے

کیا کہیں پاسِ محبت نہیں اُٹھنے دیتا
یہ نہ سمجھو کہ بھکاری ہیں تمہارے در کے

غمِ جاں بھی غمِ جاناں بھی غمِ دَوراں بھی
ایک دل کے لئے سامان ہیں دُنیا بھر کے



جس جگہ بیٹھنا دُکھ درد ہی گانا ہم کو
اور آتا ہی نہیں کوئی فسانہ ہم کو

کل ہر اک زُلف سمجھتی رہی شانہ ہم کو
آج آئینہ دکھاتا ہے زمانہ ہم کو

عقل پھرتی ہے لئے خانہ بخانہ ہم کو
عشق اب تو ہی بتا کوئی ٹھکانہ ہم کو

یہ اسیری ہے سنورنے کا بہانہ ہم کو
طوق آئینہ ہے زنجیر ہے شانہ ہم کو

جادۂ غم کے مسافر کا نہ پوچھو احوال
دُور سے آئے ہیں اور دُور ہے جانا ہم کو

ایک کانٹا سا کوئی دل میں چبھو دیتا ہے
یاد جب آتا ہے پھُولوں کا زمانہ ہم کو

دل تو سو چاک ہے دامن بھی کہیں چاک نہ ہو
اے جنُوں دیکھ ! تماشہ نہ بنانا ہم کو



زہرِ غم سے نہیں انکار کہ پینا ہے یہی
ہم غریبوں کا تو مرنا یہی جینا ہے یہی

درد کو اس لئے سینے سے لگا رکھا ہے
زندگی ایک انگوٹھی ہے نگینہ ہے یہی

ہم کبھی چُلّو میں لہُو دل کا لئے بیٹھے ہیں
ہر طرف شور ہے فصلِ مَے و مینا ہے یہی

کتنی مُدّت ہوئی آنسو نہیں تھمتے اپنے
اب یہ برسات نہ جائے گی قرینہ ہے یہی

شہر میں ہر در و دیوار پہ روشن ہیں چراغ
میرا گھر جس میں جلا تھا وہ مہینہ ہے یہی

ناز کیوں کر نہ کریں دولتِ خودداری پر
ہم نے اے وقت ترے ہاتھ سے چھینا ہے یہی

ہم تو مزدورِ محبت ہیں غزل کہتے ہیں
ایک فنکار کے ماتھے کا پسینہ ہے یہی



بول اُٹھے سب کیوں کھلا کیوں کر کھلا
ہم غریبوں کا جہاں بستر کھلا

خانہ ویرانی کو سب کچھ سونپ کر
چھوڑ آئے ہیں ہم اپنا گھر کھلا

چادرِ اوقات کی تنگی نہ پوچھ
پاؤں جب ہم نے چھپایا سر کھلا

تجربوں کا سلسلہ ہے زندگی
ہر قدم پر اِک نیا دفتر کھلا

دُشمنوں کی کیا خصوصیّت کہ اب
دوست بھی رکھنے لگے خنجر کھلا

راہ میخانے کی اُن پر بند ہے
جن پہ رازِ بادہ و ساغر کھلا

گرچہ پانی تھا شہیدوں کا لہو
رنگ کتنا تیرے دامن پر کھلا

شاعری فنکار کی شمشیر ہے
اکثر اِس تلوار کا جوہر کھلا

لوگ کہتے ہیں کہ عاجزؔ کی غزل
پھول پوشیدہ ہے اور پتھر کھلا



اشعار میں سجا کے بنا کے سنوار کے
کہئے تو ہم بھی زخم دکھائیں بہار کے

پیغام ہیں رسن کے تقاضے ہیں دار کے
فرصت کہاں کہ لطف اُٹھائیں بہار کے

ہر گل یہ کہہ رہا ہے چمن میں پکار کے
سائے سے دُور دُور ہی رہیو بہار کے

ہم کو وفا کا درس نہ دو ہم تو بیٹھے ہیں
اک عمر رسم و راہِ وفا میں گذار کے

بادہ گسار وقتِ تکلّف نہیں ہے اب
بھر لو سبو کو طاق سے مینا اُتار کے

اے باغباں یہ فرق مراتب روا نہیں
کانٹوں کو بھی سنوار گلوں کو سنوار کے

عاجزؔ غم شکستِ محبت ہے عارضی
ہم نے یہ کھیل بارہا جیتا ہے ہار کے



اے عشق! مل سکیں گے نہ ہم جیسے سرپھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

ہو جائیں خاک ہم تو یقیں ہے کہ حشر تک
سر پر یہ خاک اُٹھائے نسیمِ سحر پھرے

وہ دردمند ہیں کہ گئے جس چمن میں ہم
پھولوں کو بانٹتے ہوئے خونِ جگر پھرے

آساں نہیں ہے وضعِ جنوں کا نباہنا
تھک تھک کے راستے سے بہت ہمسفر پھرے

اِس طرح آئی دل میں تری بھولی بھٹکی یاد
جیسے بہت دنوں پہ کوئی اپنے گھر پھرے



دل سے اِک پل بھی جُدا ہو یہ گوارا ہی نہیں
ہم کو اَب درد سے بڑھ کر کوئی پیارا ہی نہیں

تیرے غم نے کیا یہ حال خوشی ہے اِس کی
رنج اس کا ہے کہ یہ حال ہمارا ہی نہیں

ہم جو مرتے ہیں محبت میں تو مرنے دیجئے
اس میں مرنے کے علاوہ کوئی چارا ہی نہیں

یہ تو اِک فرض تھا اے گیسوئے دَوراں اپنا
ہم نے اُجرت کیلئے تجھ کو سنوارا ہی نہیں

ایسا کچھ لُطف مِلا عشق کی مزدُوری میں
درد کا بوجھ کبھی سر سے اُتارا ہی نہیں

خوب آگاہ تقاضائے جُنوں سے ہم ہیں
کیا بتائیں۔ ابھی موسم کا اشارا ہی نہیں

شرم ہو گی تو خود آوے گی پلٹ کر عاجزؔ
ہم نے جاتی ہوئی دُنیا کو پُکارا ہی نہیں



ہم نے بے فائدہ چھیڑی غمِ ایام کی بات
کون بیکار یہاں ہے کہ سُنے کام کی بات

شمع کی طرح کھڑا سوچ رہا ہے شاعر
صُبح کی بات سُنائے کہ کہے شام کی بات

ہم غریبوں کو تو عادت ہے جفا سہنے کی
ڈھونڈھ ہی لیتے ہیں تکلیف میں آرام کی بات

دھوپ میں خاک اُڑا لیتے ہیں سائے کیلئے
پیاس لگتی ہے تو کرتے ہیں مے و جام کی بات

اب تو ہر سمت اندھیرا ہی نظر آتا ہے
خوب پھیلی ہے تری زُلفِ سیہ فام کی بات

صُبح کے وقت جو کلیوں نے چٹک کر کہدی
بات چھوٹی سی ہے لیکن ہے بڑے کام کی بات

کوئی کہدے کہ محبت میں بُرائی کیا ہے
یہ نہ تو کُفر کی ہے بات نہ اِسلام کی بات

گرچہ احباب نے سر جوڑ کے ڈھونڈھا عاجزؔ
نہ ملی میری غزل میں روشِ عام کی بات



یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ
عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے جاؤ

یوں تو مقتل میں تماشائی بہت آتے ہیں
آؤ اس وقت کہ جس وقت پکارے جاؤ

دل کی بازی لگے پھر جان کی بازی لگ جائے
عشق میں ہار کے بیٹھو نہیں ہارے جاؤ

کام بن جائے اگر زلفِ جنوں بن جائے
اس لئے اس کو سنوارو کہ سنوارے جاؤ

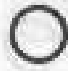
کوئی رستہ کوئی منزل اسے دشوار نہیں
جس جگہ چاہو محبت کے سہارے جاؤ

ہم تو مٹی سے اگائیں گے محبت کے گلاب
تم اگر توڑنے جاتے ہو ستارے جاؤ

ڈوبنا ہوگا اگر ڈوبنا تقدیر میں ہے
چاہے کشتی پہ رہو چاہے کنارے جاؤ

تم ہی سوچو بھلا یہ شوق کوئی شوق ہوا
آج اونچائی پہ بیٹھو کل اتارے جاؤ

موت سے کھیل کے کرتے ہو محبت عاجزؔ
مجھ کو ڈر ہے کہیں بے موت نہ مارے جاؤ

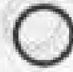


دل میں نہ ہو گداز تو بولی میں کچھ نہیں
لفظوں کے ساتھ آنکھ مچولی میں کچھ نہیں

کچھ ہم نے دلگی کے بہانے تراشے ہیں
ورنہ بسنت کچھ نہیں، ہولی میں کچھ نہیں

دیوانے شہرِ دار و رسن کو نکل گئے
اب آہوانِ دشت کی ٹولی میں کچھ نہیں

کچھ ٹھیکرے دیارِ محبّت کی یادگار
اِن کے سوا کلیم کی جھولی میں کچھ نہیں



ہیں بتکدے میں غریب اور بے وطن جیسے — اگرچہ رہتے ہیں کہتا ہے برہمن جیسے

شبابِ لالہ و گل اک ہوا کا جھونکا تھا — بہار آ کے گذر جائے دفعتاً جیسے

بغیرِ مے عجب احوالِ میکدہ ہے آج — چراغ سے رہے محروم انجمن جیسے

ملا نہ اہلِ جنوں کا مزاج داں کوئی — تمام لوگ ملے شیخ و برہمن جیسے

چھپا لیا ہے مشقّت نے عیبِ عُریانی — ہے گرد جسم پہ اس طرح پیرہن جیسے

اب اہلِ ہوش کو ہے شوقِ چاک دامانی — یہ کاروبارِ جُنوں بھی ہے کوئی فن جیسے

غزل سُنی تو وہ بولے کہ تم تو اے عاجزؔ

ہو خوش کلام بھی ایسے ہی کم سخن جیسے



معتبر ہیں اگر بدنام ہی ہونا ہے ہو لینگے
جو آئے جسکے جی میں بول لے ہم کچھ نہ بولینگے

اگر چاہے گا جی اپنا تو خود آزاد ہو لینگے
یہ اہلِ ہوش کیا دیوانوں کی زنجیر کھولینگے

وہ سوداگر ہیں تو سوداگری ہم کو بھی آتی ہے
وفا کو وہ جو پر کھینگے کرم کو ہم بھی تولینگے

ہمیں تو اے خرد دار و رسن کی سمت جانا ہے
اگر موقع ملے گا تیرے کوچے سے بھی ہو لینگے

متاعِ درد سے ہے انجمن کی انجمن خالی
یہ شئے ہم بانٹتے ہیں اہلِ محفل سے کہو۔ لینگے؟

کچھ اہلِ عشق نے اک کارواں اپنا بنایا ہے
وہی پہونچیں گے منزل تک جو اِنکے ساتھ ہو لینگے

چلیں ہنس بول لیں کچھ دیر بزمِ دوستاں میں عاجزؔ
اگر اُمڈے گا دل۔ جا کر کسی گوشے میں رو لینگے



موسم سب آتے ہیں لیکن موسم میں وہ بات نہیں
نکھری نکھری شام نہیں اب بہکی بہکی رات نہیں

ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جن کی بنتی کوئی بات نہیں
مرنے کی توفیق نہیں ہے جینے کی اوقات نہیں

دھوپ کہیں ہیں جب دھوپ نہیں ہو رات کہیں جب رات نہیں
دیوانوں کی بات سمجھنا سب کے بس کی بات نہیں

میخانے پر جب دیکھو تب بادل چھائے رہتے ہیں
جن کے گھر میں آگ لگی ہے اُنکے گھر برسات نہیں

دل کا کیا احوال سناؤں چپ ہی رہنے دے ہمدم
چپ رہنے میں جو لذت ہے کہنے میں وہ بات نہیں

پونجی تو افراط ہے لیکن کیسے بانٹوں کیسے دوں
درد کوئی تحفہ نہیں پیارے دکھ کوئی سوغات نہیں

بچ کر چلنے والے عاجزؔ عشق میں ہارا کرتے ہیں
جس نے بڑھ کر داؤں لگایا اسکی بازی مات نہیں



آشنا غم سے ملا راحت سے بیگانہ ملا　　دل بھی ہم کو خوبیٔ قسمت سے دیوانہ ملا

بُلبل و گُل شمع و پروانہ کو ہم پر رشک ہے　　درد جو ہم کو ملا سب سے جُداگانہ ملا

ہم نے ساقی کو بھی دیکھا پیرِ میخانہ کو بھی　　کوئی بھی اِن میں نہ رازِ آگاہِ میخانہ ملا

سب نے دامن چاک رکھا ہے بقدرِ احتیاج　　ہم کو دیوانوں میں بھی کوئی نہ دیوانہ ملا

ہم تو خیر آشفتہ ساماں ہیں ہمارا کیا سوال　　وہ تو سنوریں جن کو آئینہ ملا شانہ ملا

کیا قیامت ہے کہ اے عاجزؔ ہمیں اس دور میں
طبع شاہانہ ملی، منصب فقیرانہ ملا



پائے خرد سے وقت کی زنجیر کیا کھُلے
آگے بڑھو اے جُنوں کہ کوئی راستہ کھُلے

کس حال میں ہیں لالہ و نسرین و نسترن
کچھ کہہ۔ کہ فصلِ گُل کا بھرم اے صبا کھُلے

زنجیرِ مصلحت کو بھی لازم ہے توڑنا
یوں دست و پا کھُلے بھی تو کیا دست و پا کھُلے

ہم بھی کچھ اپنے دل کی گرہ کھولنے کو ہیں
کس کس کا آج دیکھئے بندِ قبا کھُلے

قیمت میں رند خونِ جگر لیکے آئے ہیں
ساقی کہاں ہے؟ اب تو درِ میکدہ کھُلے

محفل سے اُٹھ کے رونقِ محفل کہاں گئی
کھُل اے زبانِ شمع! کہ کچھ ماجرا کھُلے

ہے انتہا پہ روشنیٔ عقل اے جُنوں
وقت آگیا کہ اب تری زُلفِ دوتا کھُلے

دُنیا سمجھ رہی ہے بڑے مہرباں ہیں وہ
کب دیکھیں بے وفا کا فریبِ وفا کھُلے

عاجزؔ چھُری پہ اُن کی کھُلا یوں مرا لہُو
جیسے دُلہن کے ہاتھ پہ رنگِ حنا کھُلے



جب سے جوانی آئی اُن کی آ بیٹھے بہکانے لوگ
کل تک اپنے لوگ رہیں تھے آج ہیں ہم بیگانے لوگ

اپنا لہو بھر کر لوگوں کو بانٹ گئے پیمانے لوگ
دُنیا بھر کو یاد رہیں گے ہم جیسے دیوانے لوگ

اب وہ کہاں اخلاص کی شمعیں اب وہ کہاں پروانے لوگ
بیگانی بیگانی محفل انجانے انجانے لوگ

کس پر کیا کیا بیت گئی ہے کب سمجھے کب جانے لوگ
گھر بیٹھے سر دھن لیتے ہیں سُن سُن کر افسانے لوگ

جُرمِ جنوں ثابت کرنے کو موسم کی کچھ شرط نہیں
جب چاہیں تب آ جاتے ہیں زنجیریں پہنانے لوگ

کوئی دیوانہ کہتا ہے کوئی شاعر کہتا ہے
اپنی اپنی بول رہے ہیں ہم کو بے پہچانے لوگ



باغ میں صبح و شام آنا جانا رہا لالہ و گُل سے ملنا ملانا رہا
جس زمانے کی یہ بات ہے دوستو اب وہ موسم نہ اب وہ زمانہ رہا

ہم غزل گائیں تو رقص کر ساقیا کہ سلامت ترا بادہ خانہ رہا
مے تو جام و صراحی میں بھرپور ہے خوں ہماری رگوں میں رہا نہ رہا

کون اے عشق تیرا پُجاری بنے بزم میں کوئی اہلِ وفا نہ رہا
ایک گوشے میں ہم رہ گئے ہیں یہاں سو ہمارا بھی اب کیا ٹھکانہ رہا

یہ تو سچ ہے کہ سرمایۂ آبرو آج چند آنسوؤں کے سوا نہ رہا
طنز سے جن پہ تم ہنس رہے ہو گلو! کل انہیں جیب و دامن میں کیا نہ رہا

یوں تو کہنے کو ہم چاک داماں بھی ہیں زلف برہم کی صورت پریشاں بھی ہیں
جب سے سر پھوڑ لینے کی عادت گئی تب سے دیوانگی میں مزا نہ رہا

عقل بے چاری لرزہ بر اندام ہے ہمتِ عشق چل اب ترا کام ہے
منزلِ دار پر لوگ یوں رُک گئے جیسے آگے کوئی راستہ نہ رہا

گرچہ عاجز ہیں ہم اور نادار ہیں محفلِ شادؔ کے رند خود دار ہیں
یہ خدا ساز چلّو سلامت رہے جام کی کیا شکایت رہا نہ رہا



اوروں کا دُکھ درد اپنا کر نکلے ٹھوکر کھانے ہم — سب سے دیوانہ تھا مجنوں اُس سے بھی دیوانے ہم

گلشن گلشن آئے گئے لیکن نہ گئے پہچانے ہم — کس گُل کے ہیں بُلبُل ہم کس شمع کے ہیں پروانے ہم

وہ جو سب میں ناکارے ہیں ہم کو سب سے پیارے ہیں — محفل محفل ڈھونڈھ رہے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے ہم

خون کے پیاسے دل میں ٹھنڈک سوزِ محبت سے ہوگی — دُنیا پانی مانگ رہی ہے آگ چلے بھڑکانے ہم

اب تک ہُشیاروں نے ہم کو زنجیریں پہنائی ہیں — اب جائینگے ہُشیاروں کو زنجیریں پہنانے ہم

خواب میں ہمکو عشق نے اپنا شیش محل دکھلایا ہے — رستے سے گرچہ نہیں واقف منزل ہیں پہچانے ہم

عاجزؔ یہ البیلی باتیں بے سمجھی کی بات نہیں

خود سمجھا ہے تب نکلے ہیں دُنیا کو سمجھانے ہم



گلوں کے سر تو ہمارے ہی فکر و فن سے اُٹھے
بہار ساتھ اُٹھے گی جو ہم چمن سے اُٹھے

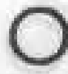
جو کم نگاہ و تہی ذوق و تنگ دامن تھے
سُنا ہے بھر کے وہ جھولیاں چمن سے اُٹھے

حدودِ دیر و حرم سے نکال دو ان کو
جو فتنے اُٹھے اِنہی شیخ و برہمن سے اُٹھے

رہے گا رنگ جما کر لہو شہیدوں کا
یہ داغ وہ نہیں جو اُن کے پیرہن سے اُٹھے

اس انتظار میں بیٹھی ہے وقت کی شیریں
کہ کوہ کن کوئی پھر خاکِ کوہکن سے اُٹھے

کلیجہ خون کیا جن کی انجمن کے لئے
کلیجہ تھام کے ہم اُن کی انجمن سے اُٹھے



آجاتی ہے اُسی بُتِ پیماں شکن کی بات
خلوت کی بات کیجیے یا انجمن کی بات

آساں ہو کچھ تو سختیٔ زنجیر اے جنوں
ہاں چھیڑ اُن کی زلفِ شکن در شکن کی بات

بیٹھا ہوا ہر ایک ملاتا ہے ہاں میں ہاں
جو تیری بات ہے وہ تیری انجمن کی بات

ہم سے زیادہ کس کا بیاں ہوگا معتبر
ہم نے زبانِ گُل سے سُنی ہے چمن کی بات

اُس کی تو دھجیاں ہی اُڑا دیں بہار نے
اب پیرہن کہاں کہ کریں پیرہن کی بات

اِک دھوم ہے کہ شمع ہے یوں انجمن ہے یوں
کس شمع کی یہ بات ہے کس انجمن کی بات؟

فرصت کہاں کہ بات کسی کی سُنے کوئی
اور وہ بھی میرے جیسے غریب الوطن کی بات



جب کبھی عالمِ مستی میں غزل کہتے ہیں
آج کہہ دیتے ہیں ہم لوگ جو کل کہتے ہیں

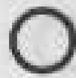
اِک نئی شاعری آغازِ قدم کرتی ہے
اہلِ دل جب غمِ دل پہلے پہل کہتے ہیں

ہاتھ رکھے کوئی اور اس کا ٹھکنا دیکھے
دل اِسے کہتے ہیں یا زخمِ بغل کہتے ہیں

دردمندانِ محبّت کا نہ دل توڑ لے دوست!
تاج محلوں کا اِسے تاج محل کہتے ہیں

مرنا جینا ہو محبّت کے لئے اِس کے سوا
اور کیا ہے کہ جسے حُسنِ عمل کہتے ہیں

آزمانا ہو تو آ بازو و دل کی قوت
تو بھی شمشیر اُٹھا ہم بھی غزل کہتے ہیں



جو خود سے نہ انگڑائی لیکر اُٹھا
اُسے وقت کی دیگی ٹھوکر اُٹھا

مزہ پیاس کا زندگی بھر اُٹھا
سبو ہاتھ میں لے نہ ساغر اُٹھا

یہ احساں بھی مت رکھ ستمگر اُٹھا
میں گردن جُھکاؤں تو خنجر اُٹھا

ہے چُپ بیٹھنا شرطِ محفل اگر
یہ بندہ تو اے بندہ پرور اُٹھا

کہاں فرصتِ خوابِ شیریں ہمیں
اُٹھا فصلِ گُل اپنا بستر اُٹھا

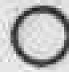
اب اِک جُھوٹے تَوں اُن سے اُٹھتی نہیں
جن آنکھوں سے پہلے سمندر اُٹھا

نہ اُٹھتے تری بزم سے جیتے جی
یہ غم کیا کہیں ہم سے کیونکر اُٹھا

جسے زخمِ دل ہم دِکھانے گئے
وہی ہاتھ میں لیکے پتھر اُٹھا

شکایت کا حاصل یہاں کچھ نہیں
جو غم بھی اُٹھا مُسکرا کر اُٹھا

نہ عاجزؔ کی سُنیو غزل دوستو
جو سُننے کو بیٹھا وہ رو کر اُٹھا



ہاتھ میں جام لئے دوش پہ مینا رکھے
ساقی اَب آئے بہت ہم کو نہ پیاسا رکھے

دل اُسی کا ہے وہ برباد کرے یا رکھے
جس طرح چاہے چمن کو چمن آرا رکھے

ہم نشیں اور ہیں کچھ تو ادب اُن کا رکھے
درد پہلو میں بہت پاؤں نہ پھیلا رکھے

راہ میں فرش ہیں اربابِ چمن کی آنکھیں
دیکھ کر بادِ بہاری قدم اپنا رکھے

دوسرا کون ہے بازارِ وفا میں ہم سا
جنس نایاب بھی دے دام بھی سستا رکھے

دیکھ لے آج کہ اب تک کسی قابل ہم ہیں
کل خدا جانے زمانہ ہمیں کیسا رکھے

دل ہی کمبخت ٹھکانے نہیں رہتا عاجزؔ
کس توقع پہ کوئی دل میں تمنّا رکھے



کیا ہنسیں اب ہنسی کا نہیں نام تک
صُبح بیٹھے تو روتے رہے شام تک

پہلے اُٹھتی تھیں ہم پر فقط اُنگلیاں
اب تو سُنتے ہیں گلیوں میں دشنام تک

ہر طرف اُن کی زلفوں کے ہیں تذکرے
شام سے صُبح تک، صُبح سے شام تک

فاصلے ہیں بہت مرحلے ہیں بہت
تشنگی سے خُم و شیشہ و جام تک

اب بھی کوئی وفادار کہتا ہمیں
سہہ گئے بے وفائی کا الزام تک

کر نہ سکئے محبت تو مر جائیے
زندگی کام کی ہے اِسی کام تک



اپنے دل کی بات شاعر بے حجابانہ کہے　　چاہے پتھر کوئی مارے چاہے دیوانہ کہے

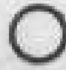
ہم کو ساقی ہوش سے کہتا ہے بیگانہ۔ کہے　　چُپ نہیں رہنے کے ہم بے رازِ میخانہ کہے

کس نے سلجھائیں یہ زلفیں کیا یہ دیوانہ کہے　　خود ترا آئینہ بولے خود ترا شانہ کہے

نکلے ہم بے آبرو ہی آبروئے میکدہ　　ویسے کہنے کو جو چاہے پیرِ میخانہ کہے

ہم بھی گذرے ہیں غمِ جاناں کی منزل سے مگر

اب کسے فرصت کہ بیٹھے اور یہ افسانہ کہے



مُجرم ہیں ہمیں اُن کے گنہگار ہمیں ہیں
وقت آئے تو مرنے کو بھی تیار ہمیں ہیں

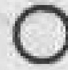
پھولوں کے لئے سینہ ہمارا ہی سپر ہے
اِس صحنِ چمن کے در و دیوار ہمیں ہیں

مشہور جو اِک قافلۂ اہلِ جنوں ہے
اُس قافلے کے قافلہ سالار ہمیں ہیں

جُھک جانے کی عادت ہے یہ بات اور ہے ورنہ
کِھنچ جائیں تو پھر وقت کی تلوار ہمیں ہیں

آئے تو ہیں بازار میں کچھ اہلِ وفا اور
اب بھی سببِ گرمیٔ بازار ہمیں ہیں

جس شمع سے ہے انجمنِ یار کی رونق
وہ شمع سرِ انجمنِ یار ہمیں ہیں



بہکی بہکی بات اپنی منتشر بیاں اپنا
ہم ہیں جس جگہ بیٹھے دل نہیں وہاں اپنا

اُن کی بزم سے مقتل، صحن سے مکاں اپنا
اِک قدم یہاں اپنا اِک قدم وہاں اپنا

آستین و دامن سے رُک نہیں سکے آنسو
دیکھئے ٹھہرتا ہے قافلہ کہاں اپنا

تم ہو یا زمانہ ہو ہم تو یہ سمجھتے ہیں
تم بھی مہرباں اپنے وہ بھی مہرباں اپنا

وہ ستم پہ بھی منصف ہم وفا پہ بھی مجرم
دوست اِک جہاں اُن کا دشمن اک جہاں اپنا

عقل و عشق کی دُنیا اپنی دیکھی بھالی ہے
راستہ گزرتا ہے اِن کے درمیاں اپنا



ہر چوٹ پہ پوچھے ہے۔ "بتا یاد رہے گی"؟
ہم کو یہ زمانے کی ادا یاد رہے گی

دن رات کے آنسو سحر و شام کی آہیں
اس باغ کی یہ آب و ہوا یاد رہے گی

کس دھوم سے بڑھتی ہوئی پہونچی ہے کہاں تک
دُنیا کو تری زُلفِ رسا یاد رہے گی

کرتے رہیں گے تم سے محبّت بھی وفا بھی
گو تم کو محبّت نہ وفا یاد رہے گی

کس بات کا تو قول و قسم لے ہے برہمن
ہر بات بُتوں کی بخدا یاد رہے گی

چلتے گئے ہم پھول بناتے گئے چھالے
صحرا کو میری لغزشِ پا یاد رہے گی

جس بزم میں تم جاؤ گے اُس بزم کو عاجزؔ
یہ گفتگوئے بے سر و پا یاد رہے گی



مقدر نے اُٹھایا اُٹھ تو اُس محفل سے آئے ہیں
ہمیں جانے ہیں کیسے آئے ہیں کس دل سے آئے ہیں

فسانہ لیلیٰ غم کا لئے محمل سے آئے ہیں
یہ آنسو آنکھ سے آئے نہیں ہیں دل سے آئے ہیں

خدا کھے غموں کو حسرتوں کو آرزوؤں کو
چلیں محفل میں کیا؟ باہر کہاں محفل سے آئے ہیں

گلی سے ایک اپنے مہرباں کے آئے ہیں لیکن
یہ حالت ہے کہ جیسے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

غزل میں یہ سلیقہ گفت گو کا سہل مت جانو
یہاں تک ہم جو آئے ہیں بڑی مشکل سے آئے ہیں



مِری شاعری میں نہ رقصِ جام نہ مے کی رنگ فشانیاں
وہی دکھ بھروں کی حکایتیں وہی دِل جلوں کی کہانیاں

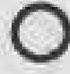
یہ جو آہ و نالہ و درد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کے رفیق ہیں یہی میری رات کی رانیاں

یہ مری زباں پہ غزل نہیں میں سنا رہا ہوں کہانیاں
کہ کسی کے عہد شباب پر مٹیں کیسی کیسی جوانیاں

کبھی آنسوؤں کو سکھا گئیں مرے سوزِ دل کی حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گئیں مرے آنسوؤں کی روانیاں

ابھی اس کو اس کی خبر کہاں کہ قدم کہاں ہے نظر کہاں
ابھی مصلحت کا گزر کہاں کہ نئی نئی ہیں جوانیاں

یہ مرا بیاں یہ گفتگو ہے مرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کبھو نہ سکو گے ایسی کہانیاں



جھیل کر کشمکشِ دیر و حرم جاتے ہیں
چین سے شیخ و برہمن رہیں، ہم جاتے ہیں

جان جاتی ہے تبھی عشق کے غم جاتے ہیں
یہ جب آتے ہیں کسی گھر میں تو کم جاتے ہیں

ساتھ کوئی نہیں جس راہ میں، ہم جاتے ہیں
بیٹھ جاتے ہیں جو دو چار قدم جاتے ہیں

جانے کیا انجمن ہوش کا اب نقشہ ہے
نہ وہاں سے کوئی آتا ہے نہ ہم جاتے ہیں

اک نہ اک رہتی ہے اُفتاد سرِ میخانہ
اہلِ دیر آتے ہیں جب اہلِ حرم جاتے ہیں

تو ہی اے گردشِ ایام ہے سب سے آگے
تجھ سے آگے کوئی جاتا ہے تو ہم جاتے ہیں



ہمیں ہیں آئینہ، آئینہ ساز، آئینہ گر۔ دیکھو
اُدھر کیا دیکھتے ہو، اُس طرف کیا ہے؟ اِدھر دیکھو

وہ زلفیں جن کو شانوں تک رسا ہونا نہ آتا تھا
اُنہیں پہونچا دیا میرے ہُنر نے تا کمر۔ دیکھو

تمہیں چاہا تمہارے جَور کو بیداد کو چاہا
مرا ارمان دیکھو، حوصلہ دیکھو، جگر دیکھو

اگر یہ دیکھنا چاہو قیامت کس کو کہتے ہیں
اُٹھو محفل سے باہر آؤ اپنی رہگذر دیکھو

سُنا ہے تم کو ہم سے بیوفائی کی شکایت ہے!
ذرا آنکھیں ملاؤ ہم سے۔ مُنہ پھیرو۔ اِدھر دیکھو

اُسی فنکار کی کاریگری ہے کارسازی ہے
مرا زخمِ جگر کیا دیکھتے ہو اپنی نظر دیکھو



کیا جانے تمھیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے
ہم کو تو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے

اُڑ اُڑ کے یہ خاکسترِ پروانہ کہے ہے
کر کے بھی دکھائے ہے جو دیوانہ کہے ہے

جو توڑنے والے ہیں کہاں اُن کو یہ معلوم
ٹوٹے ہے تو کیا ٹوٹ کے پیمانہ کہے ہے

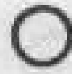
سوچوں ہوں تو میں سوچ کے رہ جاؤں ہوں حیراں
کیا تم کہو ہو کیا دلِ دیوانہ کہے ہے

چھیڑے ہے کوئی تذکرۂ اہلِ وفا جب
مُنہ پھیر کے کچھ شمع سے پروانہ کہے ہے

بے وجہ خفا ہوتے ہو باتوں سے ہماری
ہم کیا کہیں ہیں جو تمھیں دُنیا نہ کہے ہے

نغموں کو میرے سُن کے ہے بُلبل کا جگر چاک
دیوانہ ہی سمجھے ہے جو دیوانہ کہے ہے

کب تک سُنیں عاجزؔ سے غمِ دل کی حکایت
کمبخت ہمیشہ یہی افسانہ کہے ہے



زخموں میں جب ٹیس اُٹھے ہے تم ہی تو یاد آؤ ہو
ہم تم کو پہچان رہے ہیں منہ پھیرے کیا جاؤ ہو

اتنا کیوں سنورو ہو اتنا زُلفیں کیوں سُلجھاؤ ہو
پیارے ہم سب جانے ہیں تم کیا ہو کیا کہلاؤ ہو

بُھولے بِسرے ارمانوں کو چھیڑو ہو اُکساؤ ہو
تم تو اور لے ٹھنڈی آہ ہو دل میں آگ لگاؤ ہو

زنجیریں کیا ہاتھ آئی ہیں مچلو ہو اِتراؤ ہو
جب چاہو ہو کھولو ہو جب چاہو ہو پہناؤ ہو

منزل جانی پہچانی ہے رستہ جانا بوجھا ہے
کاہے ایسی چال چلو ہو جس سے ٹھوکر کھاؤ ہو

دریا میں طوفان اٹھا ہے دریا والے جھیلینگے
تم تو دُور کھڑے ہو پیارے تم کاہے گھبراؤ ہو

میری غزل پر کیوں رکھو ہو تلخ کلامی کا الزام
میں تو چُپ رہنا چاہوں ہوں تم ہی مُنہ کُھلواؤ ہو

موسم گُل کی کچھ باتیں ہیں لیکن تم سے کون کہے
تم تو بس سُنتے ہی عاجزؔ دیوانے ہو جاؤ ہو



وقت جب قول کے بندوں سے عمل مانگے ہے — کوئی دبکے ہے کہیں، کوئی کہیں بھاگے ہے

چین کی راہ نہ پیچھے نہ ترے آگے ہے — بیٹھ جا عشق کے سائے میں کہاں بھاگے ہے

ان کے امکانِ رسائی سے یہ شئے آگے ہے — اہلِ بازار سے کیا جنسِ وفا مانگے ہے

کچھ نہ کچھ ہو غمِ جاں ہو کہ غمِ جاناں ہو — درد کی چوٹ لگے ہے تو یہ دل جاگے ہے

منزلِ دار و رسن عشق کی منزل نہ سمجھ — یہ مقام اُس سے بہت آگے بہت آگے ہے

کب سے ہوں نغمہ بلب بزم کے سنّاٹے میں — کیا سُنے ہے کوئی آواز؟ کوئی جاگے ہے؟

جب کہیں قافلۂ اہلِ خرابات چلا
دیکھا عاجزؔ کو لئے سازِ غزل آگے ہے



ہاں دیکھ ذرا کیا ترے قدموں کے تلے ہے
ٹھوکر بھی وہ کھائے ہے جو اترا کے چلے ہے

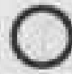
کیا دل ہے کہ آرام سے اک سانس نہ لے ہے
محفل سے جو نکلے ہے تو خلوت میں جلے ہے

بھولی ہوئی یاد آ کے کلیجے کو ملے ہے
جب شام گذر جائے ہے جب رات ڈھلے ہے

سکھ چھینے ہے اور چین کے بیدرد زمانہ
یوں چین سے سوئے ہے کہ کروٹ بھی نہ لے ہے

کس طرح کوئی دھوپ میں پگھلے ہے جلے ہے
یہ بات وہ کیا جانے جو سائے میں پلے ہے

غافل نہ کبھی بیٹھیو اس بزم میں رندو!
ساغر یہاں ٹھہرے ہے تو شمشیر چلے ہے



گذر جائینگے جب دن گذرے عالم یاد آئینگے
ہمیں تم یاد آؤ گے تمہیں ہم یاد آئینگے

محبّت میں۔ جو کچھ ہم کر گئے، کس نے کیا ہوگا؟
جہاں سب بھول جاؤ گے وہاں ہم یاد آئینگے

پھر ایسا آئینہ شاید ترے آگے نہ آئے گا
بہت ہم تجھ کو اے گیسوئے برہم یاد آئینگے

خدا کا شکر ہے احساں فراموشی نہیں آتی
ہمیشہ آپ کے بخشے ہوئے غم یاد آئینگے

بہت یاد آگئی بے التفاتی چشم ساقی کی
یہ شیشے یہ سبو یہ جام تو کم یاد آئینگے

پھر اپنے سازِ دل پر ہم نے چھیڑی ہے غزل سُن لو
یہ دُھن یاد آئے گی یہ سُر، یہ سرگم یاد آئینگے



یہ شب انہیں زلفوں کی کرامات لگے ہے
سنتے تھے غزل میں یہ وہی رات لگے ہے

پتھر کی طرح تیری ہر اک بات لگے ہے
دل توڑ کے ناصح تجھے کیا ہات لگے ہے

مرنا تو بہت سہل سی اک بات لگے ہے
جینا ہی محبت میں کرامات لگے ہے

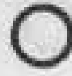
ہم نے جو دیا ہے وہ ہمیں جان سے پیارا ہے
سرمایۂ غم مفت کہاں ہات لگے ہے

آرام کہاں اہل وفا کو کسی کروٹ
اک آگ ہے سینے میں جو دن رات لگے ہے

اوروں سے محبت بھی تعلق بھی وفا بھی
ہم سے تو کبھی کی نہ ملاقات لگے ہے

ہم دونوں میں ہے بس اسی بات کی تکرار
وہ دن کہے ہیں اور ہمیں رات لگے ہے

وہ جانیں جو تعریف کیا کرتے ہیں عاجزؔ
ہم کو تو غزل تیری خرافات لگے ہے



پڑھنے کو غزل عاجزؔ محفل میں جب آئے ہے
اپنے بھی وہ روئے ہے ہم کو بھی رُلائے ہے

کیا کھیل محبت بھی کھیلے ہے کھلائے ہے
ہارے ہے سو جیتے ہے کھوئے ہے سو پائے ہے

جب سے ترے دیوانے نکلے تری محفل سے
کیا حال ہے محفل کا دیکھا نہیں جائے ہے

شاعر تو نہیں عاجزؔ سائل ہے محبت کا
کشکولِ غزل لے کر آواز لگائے ہے



میرے ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو

دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو دشمن کو بھی تم مات کرو ہو

ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آکے ملو۔ دُور سے کیا بات کرو ہو

ہم کو جو ملا ہے وہ تمہیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھُلا دیں تمہیں؟ کیا بات کرو ہو

یوں تو کبھی منھ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو
جب وقت پڑے ہے تو مدارت کرو ہو

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

بکنے بھی دو عاجزؔ کو جو بولے ہے بکے ہے
دیوانہ ہے، دیوانے سے کیا بات کرو ہو



مرا حال پُوچھ کے ہم نشیں مرے سوزِ دل کو ہوا نہ دے
بس یہی دُعا میں کروں ہوں اب کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے

یہ جو زخمِ دل کو پکائے ہم لئے پھر رہے ہیں چھپائے ہم
کوئی نا شناس مزاجِ غم کہیں ہاتھ اِس کو لگا نہ دے

تو جہاں سے آج ہے نکتہ چیں کبھی مدتوں میں رہا وہیں
میں گدائے راہگزر نہیں مجھے دور ہی سے صدا نہ دے

تب و تاب عشق کا ہے کرم کہ جمی ہے محفلِ چشم نم
ذرا دیکھیو اے ہوائے غم یہ چراغ کوئی بجھا نہ دے

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سُناؤں ہوں اسلئے کہ زمانہ اُسکو بُھلا نہ دے



نہ اہلِ بتکدہ چاہیں نہ اربابِ حرم چاہیں
زمانے میں جسے کوئی نہ چاہے اُس کو ہم چاہیں

ہم ایسے سیر چشم اوروں سے کیا چشمِ کرم چاہیں
خدا توفیق دے تو بس تجھی کو اے صنم چاہیں

ستم کر لیں جہاں تک تیرے اربابِ ستم چاہیں
جو تو چاہے ہے ہم سے اے زمانہ کیسے ہم چاہیں

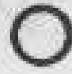
یہ ممکن ہے کہ ہم اُن کو بہت چاہیں وہ کم چاہیں
یہ مشکل ہے کہ وہ اوروں کو چاہیں اُنکو ہم چاہیں

جنوں جب چاہتا ہے راہ پیدا کر ہی لیتا ہے
وہ ڈالیں گیسوؤں میں اپنے جتنا پیچ و خم چاہیں

بہت دیکھا ہے دل اہلِ کرم کا ہم فقیروں نے
فقیروں کا بھی دل دیکھیں اگر اہلِ کرم چاہیں

ابھی تو جس طرح وہ چاہتے ہیں دن گذرتے ہیں
وہ دن آئے کہ دن ہم یوں گذاریں جیسے ہم چاہیں

وہ جانِ آرزو عاجز ہے اتنا آرزو دشمن
کہ مرنے بھی نہ دے ہم کو اگر مرنا بھی ہم چاہیں



کلیم آ کے بھی اپنا ہنر دکھا بھی گئے
الاپ بھی گئے، رو بھی گئے، رُلا بھی گئے

غزل بھی پڑھ گئے محفل کو سنا بھی گئے
اک آگ لائے بھی، لے بھی گئے، لگا بھی گئے

وہ چوٹ کھائی جگر پر کہ تلملا بھی گئے
مگر تھے وضع کے پابند، مُسکرا بھی گئے

سُنا گئے کسی پردہ نشیں کا افسانہ
وہ شوخ پردہ نشیں کون ہے بتا بھی گئے

وفا شعاروں کو کیا پوچھو ہو! زمانہ ہوا
وہ چھوڑ بھی گئے بستی کو۔ گھر جلا بھی گئے

زمانہ دنگ ہے عاجز کہ اِس زمانے میں
جو کہہ رہے تھے وہی کرکے ہم دکھا بھی گئے



نظر کو آئینہ دل کو ترا شانہ بنادینگے
تجھے ہم کیا سے کیا اے زلفِ جانانہ بنادینگے

ہمیں اچھا ہے بن جائیں سراپا سرگذشت اپنی
نہیں تو لوگ جو چاہیں گے افسانہ بنادینگے

اُمید ایسی نہ تھی محفل کے اربابِ بصیرت سے
گناہِ شمع کو بھی جُرمِ پروانہ بنادینگے

ہمیں تو فکر دل سازی کی ہے، دل ہے تو دُنیا ہے
صنم پہلے بنادیں پھر صنم خانہ بنادینگے

نہ اتنا چھیڑ کر اے وقت دیوانہ بنا ہم کو
ہوئے دیوانے ہم تو سب کو دیوانہ بنادینگے

نہ جانے کتنے دل بن جائینگے اِک دل کے ٹکڑے سے
وہ توڑیں آئینہ، ہم آئینہ خانہ بنادینگے



غرض کسی سے نہ اے دوستو کبھو رکھیو
بس اپنے ہاتھ یہاں اپنی آبرو رکھیو

زمانہ سنگ سہی آئینے کی خو رکھیو
جو دل میں رکھیو وہی سب کے رُو برُو رکھیو

رفوگرانِ خرد کے نہ جائیو نزدیک
بلا سے پیرہن چاک بے رفو رکھیو

نہ کیجیو کہیں توہین اپنے چلّو کی
کسی سے مت ہوسِ ساغر و سبو رکھیو

چراغ گھر میں میسّر نہیں رہے نہ سہی
جلائے دل میں مگر شمعِ آرزو رکھیو

نہ جانے کون اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے
بہت سنبھال کے اس بزم میں سبو رکھیو

زبانِ درد بہت کم سمجھنے والے ہیں
یہاں نہ ہر کس و ناکس سے گفتگو رکھیو

اُڑا نہ دیجیو سب غم کی رنگ رلیوں میں
بچا کے دل کے پیالے میں کچھ لہُو رکھیو

ہر ایک ظرف برابر نہیں ہے اے بُلبُل
جو آگ سینے میں رکھوں ہوں میں نہ تو رکھیو

یہی بچائے گی شمشیرِ وقت سے عاجزؔ
ہماری بات قریبِ رگِ گلُو رکھیو



مُنہ فقیروں سے نہ پھیرا چاہیے ۔ یہ تو پوچھا چاہیے کیا چاہیے

چاہ کا معیار اُونچا چاہیے ۔ جو نہ چاہیں اُن کو چاہا چاہیے

کون چاہے ہے کسی کو بے غرض ۔ چاہنے والوں سے بھاگا چاہیے

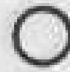
ہم تو کچھ چاہے ہیں تم چاہو ہو کچھ ۔ وقت کیا چاہے ہے دیکھا چاہیے

چاہتے ہیں تیرے ہی دامن کی خیر ۔ ہم ہیں دیوانے ہمیں کیا چاہیے

بے رُخی بھی ناز بھی انداز بھی ۔ چاہیے لیکن نہ اتنا چاہیے

ہم جو کہنا چاہتے ہیں کیا کہیں ۔ آپ کہہ لیجے جو کہنا چاہیے

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیمؔ
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے



تیرے گیسوؤں میں تو شانہ پڑے ہے
ہمارے ہی پیچھے زمانہ پڑے ہے

طبیعت کو قابو میں لانا پڑے ہے
اُٹھے ہے کہاں غم۔ اُٹھانا پڑے ہے

کبھی ایسا بھی ہو وے ہے۔ روتے روتے
جگر تھام کر مُسکرانا پڑے ہے

یہ کیسی فضائے چمن ہو گئی ہے
گلوں سے بھی دامن بچانا پڑے ہے

کبھی اُس طرف جائیو اے صبا تو
مرا جس طرف آشیانہ پڑے ہے

عجب حادثہ زندگی ہے کہ اِس میں
ہر اِک حادثہ بھول جانا پڑے ہے

ہمیں جب لگے ہے جھڑی آنسوؤں کی
وہی مے کشی کا زمانہ پڑے ہے

سپاہی سے شاعر بنے۔ دیکھنا ہے
ہمیں بھیس اب کیا بنانا پڑے ہے



اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے؟

اُس سے کہدو جو بہت مست مئے ناز میں ہے
اُسکی آنکھوں میں ہے جادو، مری آواز میں ہے

بے نیازی پہ بھی دل بندگیٔ ناز میں ہے
ہائے کیا سحر تری چشم فسوں ساز میں ہے

خَم ہر اک صبح نیا زلفِ شکن ساز میں ہے
روز اِک تازہ تکلّف مرے اعزاز میں ہے

میں محبت نہ چھپاؤں تو عداوت نہ چھپا
نہ یہی راز میں اب ہے نہ وہی راز میں ہے

پہلے سب کچھ مرے خلوت کدۂ شوق میں تھا
اب تو جو کچھ ہے تری انجمنِ ناز میں ہے

ہے جو سرمایہ مری ساری غزل گوئی میں
وہ تری ایک نگاہِ غلط انداز میں ہے

ایک مدت ہوئی اُس حادثۂ دل کو کلیمؔ
آج تک دل کا تڑپنا اُسی انداز میں ہے



اب بھی حاصل ہے انہیں حاصلِ ارماں ہونا
کیسے دیکھوں تری زلفوں کا پریشاں ہونا

میں تری چشمِ فسوں گر کو نہ دونگا الزام
اپنی قسمت ہی میں تھا چاک گریباں ہونا

ایسا بے درد کوئی سارے زمانے میں نہیں
جس کو آتا ہے میرے درد کا درماں ہونا

اپنی حالت پہ یہ اکثر میری کیفیت ہے
آئینہ دیکھنا اور دیکھ کے حیراں ہونا

ہر طرف حکم ہے اشکوں کے ستارے لاؤ

طے ہوا ہے کسی محفل میں چراغاں ہونا



کون عاجز صلۂ تشنہ دہانی مانگے
یہ جہاں آگ اُسے دیتا ہے جو پانی مانگے

دل بھی گردن بھی ہتھیلی پہ لئے پھرتا ہوں
جانے کب کس کا لہو تیری جوانی مانگے

توڑیئے مصلحتِ وقت کی دیواروں کو
راہ جس وقت طبیعت کی روانی مانگے

مانگنا جُرم ہے فنکار سے ترتیبِ خیال
گیسوئے وقت جب آشفتہ بیانی مانگے

ساقی تو چاہے تو وہ دَور بھی آسکتا ہے
کہ ملے جامِ شراب اُس کو جو پانی مانگے

کس کا سینہ ہے جو زخموں سے نہیں ہے معمور
کیا کوئی تجھ سے محبت کی نشانی مانگے

دل تو دے ہی چُکا اب ہے یہ ارادہ اپنا
جان بھی دے دوں جو وہ دشمنِ جانی مانگے

ہیں مرے شیشۂ صہبائے سخن میں دونوں
نئی مانگے کوئی مجھ سے کہ پُرانی مانگے



ترکِ وفا ستم ہے محبّت سرشت کو
دوزخ میں کیسے چھوڑ کے جائے بہشت کو

پہونچا ہوں میکدے میں یہ احساں انہیں کا ہے
بھولوں گا اہلِ کعبہ نہ اہلِ کنشت کو

ہر راہ دیر و کعبہ سے آئی ہے میکدہ
ہر راہ میکدے سے گئی ہے بہشت کو

تم میرے فکر و فن کا اگر حوصلہ بڑھاؤ
دُنیا میں کھینچ لاؤں فضائے بہشت کو

سب آئینے سب آئینہ خانے انہیں سے ہیں
میں سنگ و خشت کیسے کہوں سنگ و خشت کو

وہ تو بے درد ہے ایسا کہ بتائے نہ بنے
دل وہ کم بخت کہ بے اس سے لگائے نہ بنے

عالم ایسا نہیں دیکھا کسی میخانے کا
سامنے جام ہو اور ہاتھ بڑھائے نہ بنے

حسن خود ساز بہت عشق خود آگاہ بہت
اُن سے مانے نہ بنے ہم سے منائے نہ بنے

ہائے وہ بات کہ دل تڑپے بتانے کے لئے
اور بتانے کو جو بیٹھو تو بتائے نہ بنے

کیا ستم ہے کہ وہ ظالم بھی ہے محبوب بھی ہے
یاد کرتے نہ بنے اور بھلائے نہ بنے

یوں اٹھائے ہوئے ہیں دل پہ ترے غم کا پہاڑ
کہ اب پھول بھی رکھ دو تو اٹھائے نہ بنے

لوگ ایسے کہ لگانے کو ہیں نشتر تیار
زخم ایسا کہ ذرا ہاتھ لگائے نہ بنے

تھامتے ہیں نہیں ہم وقت کا دامن عاجزؔ
ہم اگر تھام لیں دامن تو چھڑائے نہ بنے



غم کی آگ بڑی البیلی کیسے کوئی بجھائے
اندر ہڈی ہڈی سلگے باہر نظر نہ آئے

ایک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے
اس کے آگے کیا پوچھو ہو آگے کہاں جائے

گھاؤ چُنے چھاتی پر کوئی، موتی کوئی سجائے
کوئی لہو کے آنسو روئے بنسی کوئی بجائے

یادوں کا جھونکا آتے ہی آنسو پاؤں بڑھائے
جیسے ایک مسافر آئے ایک مسافر جائے

درد کا اِک سنسار پکارے کھینچے اور بلائے
لوگ کہے ہیں ٹھہرو ٹھہرو ٹھہرا کیسے جائے

کیسے کیسے دُکھ نہیں جھیلے کیا کیا چوٹ نہ کھائے
پھر بھی پیار نہ چھوٹا ہم سے عادت بُری بلائے

عاجز کی ہیں اُلٹی باتیں کون اُسے سمجھائے
دھوپ کو پاگل کہے اندھیرا دن کو رات بتائے



وقت کم ہے گفتگو پھیلائیں کیا چیر کر رکھ دیں جگر سمجھائیں کیا

زلف و رُخ کی انجمن میں کیا نہیں باہر آدابِ غزل سے جائیں کیا

تم بھی کج رفتار ہم بھی کج کُلاہ تم نہ باز آئے تو ہم باز آئیں کیا

دوست کہتے ہیں چلو بہلاؤ دل دل ہی پہلو میں نہیں بہلائیں کیا

بے وفا جیسی ہے دُنیا تم بھی ہو ہم بھی دُنیا کی طرح ہو جائیں کیا

زندگی کی کتنی باتیں چھوڑ دیں
شاعری بھی چھوڑ دیں مر جائیں کیا؟



زخم دل کا وہ نظارا ہے کہ جی جانے ہے
اتنا احسان تمھارا ہے کہ جی جانے ہے

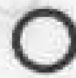
دیکھنا پھر کہیں زلفیں نہ پریشاں ہو جائیں
اتنا مشکل سے سنوارا ہے کہ جی جانے ہے

یہ حسیں دور جسے موسمِ گُل کہتے ہیں
ایسا رو رو کے گذارا ہے کہ جی جانے ہے

مہرباں حال پہ ہیں آپ ہمارے جب سے
تب سے وہ حال ہمارا ہے کہ جی جانے ہے

گرچہ جی جان کا دشمن ہے وہ ظالم پھر بھی
ایسا جی جان سے پیارا ہے کہ جی جانے ہے

کبھی گذرے ہیں چمن سے تو گُلوں نے عاجزؔ
اُس محبت سے پکارا ہے کہ جی جانے ہے



اُنہیں فریاد نازیبا لگے ہے
ستم کرتے بہت اچھا لگے ہے

خدا اس بزم میں حافظ ہے دل کا
یہاں ہر روز اک چرکا لگے ہے

اُنہیں اپنے بھی لگتے ہیں پرائے
پرایا بھی ہمیں اپنا لگے ہے

بغیر اُس بے وفا سے جی لگائے
جو سچ پوچھو تو جی کس کا لگے ہے

محبّت دل لگی جانو ہو پیارے
وہی جانے ہے دل جس کا لگے ہے

اُٹھا آگے سے ساقی جام و مینا
دل اچھا ہو تو سب اچھا لگے ہے

ذرا دیکھ آئینہ میری وفا کا
کہ تو کیسا تھا اب کیسا لگے ہے

غزل سُن کر مری کہنے لگے وہ
مجھے یہ شخص دیوانہ لگے ہے

ضرور آیا کرو جلسے میں عاجزؔ
نہ آؤ ہو تو سنّاٹا لگے ہے



مُنھ شرم سے غربت میں دِکھائے نہ بنے ہے
پُوچھے ہے کوئی گھر تو بتائے نہ بنے ہے

بیتابیٔ دل سے کبھی بن جائے ہے ایسی
بیٹھے نہ بنے ہے کہیں جائے نہ بنے ہے

بے صبر نہیں ہوں مگر آئے ہے وہ جب یاد
سچ یہ ہے کہ بے اشک بہائے نہ بنے ہے

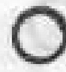
دل تھام کے کروٹ پہ لئے جاؤں ہوں کروٹ
وہ آگ لگی ہے کہ بجھائے نہ بنے ہے

ناصح یہ غمِ عشق ہے کچھ کھیل نہیں ہے
یوں تھامے ہے دامن کہ چھُڑائے نہ بنے ہے

تم دوست ہو کیسے کہ دُکھاؤ ہو دلِ دوست
دشمن کا بھی دل ہم سے دُکھائے نہ بنے ہے

اک تم ہو کہ جو چاہو ہو تم کر کے رہو ہو
اِک ہم ہیں کہ کچھ ہم سے بنائے نہ بنے ہے

آرام سے چھُپ جائے ہے پردے میں غزل کے
وہ آگ جو سینے میں چھُپائے نہ بنے ہے



جُدا جب تک تری زلفوں سے پیچ و خم نہیں ہونگے
ستم دنیا میں بڑھتے ہی رہینگے کم نہیں ہونگے

دلاسے اُنکے جو دردآشنائے غم نہیں ہونگے
نمک ہی ہونگے دل کے زخم پر مرہم نہیں ہونگے

بُتانِ فتنہ گر اس سرزمیں پر کم نہیں ہونگے
تمھارے جیسے لیکن فتنۂ عالم نہیں ہونگے

اگر بڑھتا رہا یونہی یہ سودائے ستمگاری
تمھیں رُسوا سرِ بازار ہوگے ہم نہیں ہونگے

جنابِ شیخ پر افسوس ہے ہم نے تو سمجھا تھا
حرم کے رہنے والے ایسے نامحرم نہیں ہونگے

اِدھر آؤ تمہاری زلف ہم آراستہ کردیں
جو گیسو ہم سنواریں گے کبھی برہم نہیں ہونگے

اگرچہ عشق میں مرنے کا خطرہ ہی زیادہ ہے
مگر مرنے کے ڈر سے مرنے والے کم نہیں ہونگے



بہار آبھی جا، لو لگائے ہوئے ہیں
بہت دن ہمیں مُسکرائے ہوئے ہیں

غزل کا وہی ساز اُٹھائے ہوئے ہیں
کلیجے پہ جو چوٹ کھائے ہوئے ہیں

خُدا درد والوں کو آباد رکھے
کہ جاگے ہوئے ہیں جگائے ہوئے ہیں

بڑے خوش نصیب آپ ہیں کہ ابھی تک
محبت سے پہلو بچائے ہوئے ہیں

جلائے ہیں اتنے چراغ آنسوؤں کے
ترے بام و در جگمگائے ہوئے ہیں

کسی دن تو ہاتھ آئے گا اُن کا دامن
جو دیوانہ ہم کو بنائے ہوئے ہیں

ہمیں چین سے بیٹھنے کیا کہو ہو
بڑا بوجھ دل پر اُٹھائے ہوئے ہیں

ذرا کوئی سمجھا کے عاجزؔ سے کہتا
یہ کیا حال اپنا بنائے ہوئے ہیں



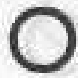
نہیں کوئی دردآشنائے دلِ من
بس اپنے ہی آنسو بس اپنا ہی دامن

مُبارک تمھیں سیرِ گلزار و گُلشن
فقیروں کا تو کوئی گھر ہے نہ آنگن

کوئی اِس طرح بھی بدلتا ہے چتون
تمھیں دوست تھے کل، تمھیں آج دشمن

گُنہگار ہم، تم بڑے پاک دامن؟
مِلاؤ تو آنکھیں اُٹھاؤ تو گردن

حسیں کیا ہوئے تم قیامت ہوئے ہو
جفا ڈیوڑھی ڈیوڑھی سِتم آنگن آنگن



زمانے کو نیند آرہی ہے جگاؤ
کلیمؔ آؤ کوئی غزل گنگناؤ

ذرا دل کے زخموں سے پردہ اُٹھاؤ
غضب کا اندھیرا ہے شمعیں جلاؤ

وہ بولے کہاں زخمِ دل ہے دکھاؤ
کہو کیا کہیں کیا بتائیں بتاؤ؟

یہاں سب کرو دل نہ ہرگز لگاؤ
ہم اس دھوکے میں آچکے تم نہ آؤ

وہ کہتے ہیں ہر چوٹ پر مُسکراؤ
وفا یاد رکھو ستم بھول جاؤ

کہاں ہو تم اے فصلِ گُل کی ہواؤ
اِدھر بھی تو گذرو یہاں بھی تو آؤ

ترنّم سے ہے گرم فریادِ عاجزؔ
بڑی تیز ہے آنچ دامن بچاؤ



فن میں نہ معجزہ نہ کرامات چاہیے
دل کو لگے بس ایسی کوئی بات چاہیے

جو چاہتے ہیں کرتے ہیں جب چاہتے ہیں وہ
دن چاہیے نہ اُن کے لئے رات چاہیے

دیوانہ دے رہا ہے سبق اہلِ ہوش کو
کیا بات اُنہیں نہ چاہیے کیا بات چاہیے

ہم کو کسی کی کم سخنی سے گِلہ نہیں
لیکن کبھی تو پرسشِ حالات چاہیے

ہر ایک بات اُس بُت کافر ادا میں ہے
لیکن وہ بات ہی نہیں جو بات چاہیے

لے جا رہا ہوں درد میں ڈوبی ہوئی غزل
بے درد کے لئے کوئی سوغات چاہیے



بڑی طلب تھی بڑا انتظار دیکھو تو
بہار لائی ہے کیسی بہار دیکھو تو

یہ کیا ہوا کہ سلامت نہیں کوئی دامن
چمن میں پھول کھلے ہیں کہ خار دیکھو تو

لہو دلوں کا چراغوں میں کل بھی جلتا تھا
اور آج بھی ہے وہی کاروبار دیکھو تو

یہاں ہر اک رسن و دار ہی دِکھاتا ہے
عجیب شہر عجیب شہریار دیکھو تو

نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ
دراز دستیٔ گیسوئے یار دیکھو تو

کسی سے پیار نہیں پھر بھی پیار ہے سب سے
وہ مستِ حُسن ہے کیا ہوشیار دیکھو تو

وہ چُپ بھی بیٹھے ہے تو ایسا بن کے بیٹھے ہے
ہر اک ادا یہ کہے ہے پُکار۔ ”دیکھو تو“

ابھی تو خُون کا سیندور ہی لگایا ہے
ابھی کرے ہے وہ کیا کیا سنگار دیکھو تو

ادا ہمیں نے سِکھائی نظر ہمیں نے دی
ہمیں سے آنکھ چُراؤ ہو یار۔ دیکھو تو

اسیر کر کے ہمیں کیا پھرے ہے اِتراتا
گلے میں ڈالے وہ پھولوں کا ہار۔ دیکھو تو



تم گُل تھے ہم نکھار ابھی کل کی بات ہے
ہم سے تھی سب بہار ابھی کل کی بات ہے

بیگانہ سمجھو، غیر کہو، اجنبی کہو
اپنوں میں تھا شمار ابھی کل کی بات ہے

آج اپنے پاس سے ہمیں رکھتے ہو دُور دُور
ہم بن نہ تھا قرار ابھی کل کی بات ہے

اترا رہے ہو آج پہن کر نئی قبا
دامن تھا تار تار ابھی کل کی بات ہے

آج اس قدر غرُور یہ انداز یہ مزاج
پھرتے تھے میر خوار ابھی کل کی بات ہے

انجان بن کے پوچھتے ہو ہے یہ کب کی بات
کل کی ہے بات یار۔ ابھی کل کی بات ہے



کیا دوسروں کے چاکِ قبا و رفو کی بات
اپنے سوا نہ کیجیو عاجز کسو کی بات

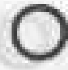
کرتے رہو غزل میں جگر کے لہو کی بات
اِس سُرخ رو سے بڑھ کے ہے کس سُرخ رو کی بات

کرنے کی باتیں دل میں بہت ہیں پڑی ہوئی
حسرت کی بات، شوق کی بات، آرزو کی بات

ہو میکشی کی بات جہاں تم بھی چھیڑ دو
اپنے شکستہ ساغر و جام و سبو کی بات

دل ہی میں ہے ہرے بھرے پھولوں کا اک چمن
جاؤ ہو ڈھونڈھنے کو کہاں رنگ و بو کی بات

ملنے کی پھر ہوس ہے ذرا کوئی جا کہو
اُس شوخ کی چھری سے ہمارے گلو کی بات



وہ بچا جائینگے دامن کیا یہ آساں کام ہے
دل کے سو ٹکڑے ہیں ہر ٹکڑے پہ اُن کا نام ہے

روشنی کی دھوم ہے لیکن اندھیرا عام ہے
صُبح بھی ایسی نظر آتی ہے گویا شام ہے

چاند ہے یہ چاندنی کرتا ہی اس کا کام ہے
ساتھ لے جاؤ غزل میری جہاں تک شام ہے

ہر غزل میں اس ستمگر کے لئے پیغام ہے
ہم تو کہتے جائینگے کہنا ہمارا کام ہے

تھوڑی تکلیفِ رسن پھر تھوڑی سی تکلیفِ دار
اِس کے بعد اے دوستو آرام ہی آرام ہے

اپنی ہی بستی میں ہم سے اپنی ہی بستی کے لوگ
پوچھتے ہیں کون سی بستی کے ہو؟ کیا نام ہے؟



تو میری طرح غمِ دل کہے تیری طرح وہ بھی ہنسا کرے
کسی بیوفا پہ او بیوفا! ترا دل بھی آئے خدا کرے

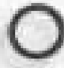
تو نہ توڑ زخموں کا سلسلہ یہ وہ دل نہیں کہ گلہ کرے
تیرے آستانۂ ناز سے جو ملا کیا ہے رِلا کرے

کوئی نکتہ چیں ہے ہوا کرے کوئی محتسب ہے رہا کرے
یہ ہے دورِ میکدۂ غزل یہ غزل کا دور چلا کرے

اُسے مشق گاہِ ستمگری نہ ملے گا میرے سوا کوئی
جو ہے میرا دشمنِ زندگی مری زندگی کی دعا کرے

یہ رُخِ نگار یہ چشم و لب ہے مرے لہو کی بہار سب
جو کرے مجھ سے وفا طلب میرا حق تو پہلے ادا کرے

نہ کلیم کی کبھی مانیو کبھی دل نہ اُس کا بڑھائیو
جو کرو ہو تم سو کیا کرو وہ غزل کہے ہے کہا کرے



رقیبوں میں رہے یا دوستوں کے درمیاں پہونچے
کہیں بھی چین سے رہنے نہ پائے ہم جہاں پہونچے

قفس کو سادہ لوحی میں سمجھ کر آشیاں پہونچے
کہا صیاد نے کس طرح سے "کہئے کہاں پہونچے"؟

غلط بدنامیوں سے مُنہ چھپانے کو جہاں پہونچے
ہمیں بدنام و رُسوا کرنے والے بھی وہاں پہونچے

چمن میں یاد کر کے اپنے ویرانے کو روتا ہوں
وہاں غم اسقدر پہونچے نہ تھے جتنے یہاں پہونچے

نہ ٹوٹا سلسلہ شیخ و برہمن کی عنایت کا
اگر یہ مہرباں رخصت ہوئے وہ مہرباں پہونچے

سُنا ہے لوگ فن سے صاحبِ فن تک پہونچتے ہیں
مگر ہم تک ہمارے ڈھونڈھنے والے کہاں پہونچے ؟



اس ناز اس انداز سے تم ہائے چلو ہو
روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

دیوانۂ گل قیدیٔ زنجیر ہیں اور تم
کیا ٹھاٹ سے گلشن کی ہوا کھائے چلو ہو

مے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ
پینا نہیں آئے ہے تو چھلکائے چلو ہو

ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا
تم کیا ہو تمہیں سب سے کہلوائے چلو ہو

زلفوں کی تو فطرت ہی ہے لیکن مرے پیارے
زلفوں سے زیادہ تمہیں بل کھائے چلو ہو

وہ شوخ ستمگر تو ستم ڈھائے چلے ہے
تم ہو کہ کلیمؔ اپنی غزل گائے چلو ہو



وہ ستم نہ ڈھائے تو کیا کرے اُسے کیا خبر کہ وفا ہے کیا
تو اُسی کو پیار کرے ہے کیوں یہ کلیمؔ تجھ کو ہوا ہے کیا؟

تجھے سنگدل یہ پتہ ہے کیا کہ دُکھے دلوں کی صدا ہے کیا
کبھی چوٹ تونے بھی کھائی ہے کبھی تیرا دل بھی دُکھا ہے کیا؟

تو رئیسِ شہرِ ستمگراں میں گدائے کوچۂ عاشقاں
تو امیر ہے تو بتا مجھے میں غریب ہوں تو بُرا ہے کیا؟

تو جفا میں مست ہے روز و شب میں کفن بدوش و غزل بلب
تیرے رعبِ حُسن سے چُپ ہیں سب میں بھی چُپ ہوں تو مزا ہے کیا؟

یہ کہاں سے آئی ہے سُرخ رو ہے ہر ایک جھونکا لہو لہو
کٹی جس میں گردنِ آرزو یہ اُسی چمن کی ہَوا ہے کیا؟

ابھی تیرا دَورِ شباب ہے ابھی کیا حساب و کتاب ہے
ابھی کیا نہ ہوگا جہان میں ابھی اِس جہاں میں ہوا ہے کیا؟

یہی ہم نوا یہی ہم سخن یہی ہم نشاں یہی ہم وطن
میری شاعری ہی بتائے گی میرا نام کیا ہے پتہ ہے کیا؟



وہ غزل اُنہیں کو سنائے گا وہ چھری اسی پہ چلائینگے
نہ کلیم اُن کو بھلائے گا نہ کلیم کو وہ بھلائینگے

چھری اُن کی ناز کرے نہ کیوں بھلا ناز کیوں نہ اُٹھائینگے
ہم اُسی سے ہونگے خفا اگر تو گلے سے کس کو لگائینگے

وہ اِن آنسوؤں کو سنگار لیں ہم اُنہیں کی زلف سجائینگے
یہ ستارے ٹانک کے اور بھی اُنہیں چار چاند لگائینگے

ہم اِسی گلی کی ہیں خاک سے یہیں خاک اپنی رلائینگے
نہ بُلائے آپ کے آئے ہیں نہ نکالے آپ کے جائینگے

وہ تو بدگمان ہیں بے سبب ہم اُنہیں پہ اپنا لُٹا کے سب
جب اُنہیں نہ اپنا بنا سکے تو اَب اور کس کو بنائینگے

ہم اگرچہ بزم سے دُور ہیں ہمیں رنگ ہیں ہمیں نور ہیں
ہم اگر نہ دینگے لہو اُنہیں وہ چراغ کیسے جلائینگے ؟



کس غضب کا لئے ہم دردِ نہاں بیٹھے ہیں
دل نے تڑپا کے اُٹھایا ہے جہاں بیٹھے ہیں

سچ تو یہ ہے جو مُسلماں بھی یہاں بیٹھے ہیں
کُشتۂ غمزہ و اندازِ بُتاں بیٹھے ہیں

بیٹھ کر پاس بھی اللہ رے دِلوں کی دُوری
ہم کہاں بیٹھے ہوئے ہیں وہ کہاں بیٹھے ہیں

تم بھی اچھا ہے بچائے ہوئے دامن اُٹھ جاؤ
آج ہم سوختہ دل شعلہ بجاں بیٹھے ہیں

سر پھرا آشفتہ مزاجوں نے اُٹھا رکھا ہے
آئیں اہلِ رسن و دار کہاں بیٹھے ہیں

نالۂ درد نہیں نغمۂ پُر سوز نہیں
بے زبانوں کی طرح اہلِ زباں بیٹھے ہیں

اپنا دل کھول کے رکھ دیجیو تب اُٹھیو عاجزؔ
لوگ سُننے کو حدیثِ دگراں بیٹھے ہیں



یونہیں ہر سال غم تازہ کرے ہے
بہار آئی۔ جہاں آیا کرے ہے

شکایت اسکی عاجزؔ کیا کرے ہے
غزل کہہ لے ہے بس اتنا کرے ہے

ترے غم میں تماشہ بن گئے ہم
جو دیکھے ہے ہمیں دیکھا کرے ہے

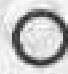
نہ جانے دل کو یہ کیا ہو گیا ہے
جو کہئے اُس کا ٹھیک اُلٹا کرے ہے

کوئی چاہے نہ چاہے یہ محبّت
جسے چاہے ہے دیوانہ کرے ہے

نہ کیجیو اعتبار اس کے سخن کا
وہ ظالم کیا کہے ہے کیا کرے ہے

وفا کرنا پڑے اُس کو تو جانے
وفاداروں کا جی کیسا کرے ہے

غزل کہنے دو عاجزؔ کو۔ نہ روکو
یونہیں رو دھو کے جی ہلکا کرے ہے



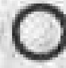
یہ کون اپنی الاپے ملھار گذرے ہے ؟ — کہ جس کی تان کلیجے کے پار گذرے ہے

ستم رسیدوں پہ جو حالِ زار گذرے ہے — کبھی وہ تیری نگاہوں سے یار گذرے ہے ؟

پڑاؤ ہے نہ کوئی آنسوؤں کی منزل ہے — یہ قافلہ یونہیں لیل و نہار گذرے ہے

گذر رہے ہیں کچھ اس طرح دن مصیبت کے — کسی کی جیسے شبِ انتظار گذرے ہے

چھُری گلے پہ چلے ہے کچھ اِس ادا کے ساتھ
چمن میں جیسے نسیمِ بہار گذرے ہے



جب دَور میں شیشہ رہے ہے جام رہے ہے
کیا جانے کہاں گردشِ ایّام رہے ہے

میخانے سے باہر ہے وہی صبح وہی شام
میخانے میں یہ صبح نہ یہ شام رہے ہے

مستی میں وہ ہو جائے ہے آسان سے آسان
مشکل سے بھی مشکل جو کوئی کام رہے ہے

اِک درد ہے جو شام سے اُٹھے ہے سحر تک
اِک سوز ہے جو صبح سے تا شام رہے ہے

بدکار بہت لوگ زمانے میں رہے ہیں
پکڑا وہی جائے ہے جو بدنام رہے ہے

تم بھی نہیں سمجھو تو بڑا ظلم ہے پیارے
ہر شعر میں دل کا کوئی پیغام رہے ہے



نہ جانے کہاں جی ڈبوئے رہے ہیں
کلیمؔ آجکل کھوئے کھوئے رہے ہیں

خودی بھی نہیں بے خودی بھی نہیں ہے
نہ جاگے رہے ہیں نہ سوئے رہے ہیں

جو اشعار نکلے ہیں اِن کی زباں سے
اِنہیں کے لہو میں ڈبوئے رہے ہیں

سمیٹے رہے ہیں یہی درد سب کا
یہ تڑپے ہیں اور لوگ سوئے رہے ہیں

بُلائے تو کیا کوئی اِن کو بُلائے
جہاں جائے ہیں روئے روئے رہے ہیں



یہ دیوانے کبھی پابندیوں کا غم نہیں لینگے
گریباں چاک جبتک کر نہ لینگے دم نہیں لینگے

لہو دینگے تو لینگے پیار، موتی ہم نہیں لینگے
ہمیں پھولوں کے بدلے پھول دو شبنم نہیں لینگے

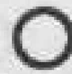
یہ غم کس نے دیا ہے پوچھ مت اے ہمنشیں ہم سے
زمانہ لے رہا ہے نام اُس کا ہم نہیں لینگے

محبت کرنے والے بھی عجب خوددار ہوتے ہیں
جگر پر زخم لینگے زخم پر مرہم نہیں لینگے

غمِ دل ہی کے ماروں کو غمِ ایام بھی دیدو
غم اتنا لینے والے کیا اب اتنا غم نہیں لینگے ؟

سنوارے جا رہے ہیں ہم اُلجھتی جاتی ہیں زلفیں
تم اپنے ذمّہ لو اب یہ بکھیڑا ہم نہیں لینگے

شکایت اُن سے کرنا گو مصیبت مول لینا ہے
مگر عاجزؔ غزل ہم بے سنائے دم نہیں لینگے



ذرا تلخیوں کا مزا لو تو جانیں
ہماری طرح دل لگا لو تو جانیں

پہاڑوں کو ہم نے اُٹھایا ہے دل پر
تم اِک کنکری بھی اُٹھا لو تو جانیں

ستم سہتے جاؤ وفا کرتے جاؤ
دُعائیں دو اور بددُعا لو تو جانیں

تڑپتا ہو دل اُمڈے آتے ہوں آنسو
اور اُس حال میں مُسکرا لو تو جانیں

یہاں دل پہ ہر روز جیسی لگے ہے
تم اِک چوٹ بھی ایسی کھا لو تو جانیں

ہمیں کو جب اپنا بنایا نہ تم نے
کسی کو بھی اپنا بنا لو تو جانیں

سُنا ہے ہمیں بے وفا تم کہو ہو
ذرا ہم سے آنکھیں ملا لو تو جانیں

غزل تم پہ عاجز نے جیسی کہی ہے
کسی اور سے کہلوا لو تو جانیں



بُلاتے کیوں ہو عاجز کو بُلانا کیا مزا دے ہے؟
غزل کمبخت کچھ ایسی پڑھے ہے دل ہلا دے ہے

محبت کیا بلا ہے چین لینا ہی بھلا دے ہے
ذرا بھی آنکھ جھپکے ہے تو بیتابی جگا دے ہے

ترے ہاتھوں کی سُرخی خود ثبوت اس بات کا دے ہے
کہ جو کہہ دے ہے دیوانہ وہ کر کے بھی دکھا دے ہے

غضب کی فتنہ سازی آئے ہے اُس آفتِ جاں کو
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگا دے ہے

مری بربادیوں کا ڈال کر الزام دُنیا پر
وہ ظالم اپنے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر مُسکرا دے ہے

اب انسانوں کی بستی کا یہ عالم ہے کہ مت پوچھو
لگے ہے آگ اک گھر میں تو ہمسایہ ہوا دے ہے

کلیجہ تھام کر سُنتے ہیں لیکن سُن ہی لیتے ہیں
مرے یاروں کو میرے غم کی تلخی بھی مزا دے ہے



کوئی کتنا ہی چلے پردا کئے
عشق کب چھوڑے ہے بے رسوا کئے

اپنا افسانہ معمہ ہی رہا
بات کیا تھی لوگ کیا سمجھا کئے

آرزو دم بھی نہ لینے پائی تھی
نا اُمیدی آگئی پیچھا کئے

بڑھنے والے کا قدم بڑھتا گیا
روکنے والے بہت روکا کئے

بے وفائی پر بھی اتنا سرخ رُو
ہم تو اُس کافر کا مُنہ دیکھا کئے

تم جب آؤ ہو غزل پڑھنے کلیم
جاؤ ہو محفل میں سناٹا کئے

یہ طرزِ خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

غزل میں کون نئی چاشنی چکھائے گا
اگر کلیمؔ نہ ہوگا مزا نہ آئے گا

چمن میں غنچے کی مانند ہے دلِ شاعر
یہ ہے اُداس تو پھر کون مسکرائے گا

اب اُس کی شبنمی باتیں فریب کیا دیں گی
وہی لگا کے گیا ہے وہ کیا بجھائے گا

خزاں کے دور میں خنجر اٹھالیا جس نے
بہار آئی تو ساغر وہی اُٹھائے گا

عُروسِ دار و رسن پر شباب ہے جب تک
مِرے مزاج سے دیوانہ پن نہ جائے گا

واللہ کس غضب کے ہو ہنس مکھ ۔ دِکھائے جاؤ — ہم آہ آہ کرتے ہیں تم مُسکرائے جاؤ

ہم تو غزل کے پھول کھلاتے ہی جائیں گے — تم جانتے ہو زخم لگانا، لگائے جاؤ

فنکار تم سِتم کے ہو، ہم شاعرِ وفا — ہم اپنی گائے جائیں، تم اپنی سُنائے جاؤ

اربابِ غم کے جلتے بدن سے رہو الگ — ہم دھوپ دھوپ جاتے ہیں تم سائے سائے جاؤ

میرے فسانے پر ہے تمھارا ہی اختیار — جو بات چاہو اپنی طرف سے مِلائے جاؤ

اپنوں کو ہم تو غیر تمھارے لئے بنائیں — اور تم ہمارے غیر کو اپنا بنائے جاؤ

دیوانے کرہی دینگے کسی روز چاک چاک — جب تک بچائے جاسکو دامن بچائے جاؤ

ہم ہیں اگر تو خونِ جگر کی کمی نہیں — جتنے چراغ بزم میں چاہو جلائے جاؤ

وہ سُن کے اَن سُنی جو کرے ہے کیا کرے
تم اے **کلیم** اپنی غزل گنگنائے جاؤ

بیاں جب کلیمؔ اپنی حالت کرے ہے
غزل کیا پڑھے ہے قیامت کرے ہے

بھلا آدمی تھا پہ نادان نکلا
سُنا ہے کسی سے محبّت کرے ہے

کبھی شاعری اِس کو کرنی نہ آتی
اُسی بے وفا کی بدَولت کرے ہے

چھُری پر چھُری کھائے جائے ہے کب سے
اور اب تک جئے ہے کرامت کرے ہے

کرے ہے عداوت بھی وہ اِس ادا سے
لگے ہے کہ جیسے محبّت کرے ہے

یہ فتنے جو ہر اک طرف اُٹھ رہے ہیں
وہی بیٹھا بیٹھا شرارت کرے ہے

قبا ایک دن چاک اُس کی بھی ہو گی
جنُوں کب کسی کی رعایت کرے ہے

اسے ہر خار و گُل پیارا لگے ہے — یہ دل کمبخت آوارا لگے ہے

سخن عاجزؔ کا کیوں پیارا لگے ہے — یہ کوئی درد کا مارا لگے ہے

کھلائے ہیں وہ گُل زخموں نے اِس کے — حسیں جن سے چمن سارا لگے ہے

لگے ہے پھول سُننے میں ہر اک شعر — سمجھ لینے پہ انگارا لگے ہے

یہ ہے ٹوٹا ہوا اُس سنگ دل کا — جو دیکھے میں بہت پیارا لگے ہے

تم آخر بدگماں عاجزؔ سے کیوں ہو

وہ بیچارا تو بیچارا لگے ہے

پہلو نہ دُکھے گا تو گذارا نہیں ہوگا
ہم سا بھی کوئی درد کا مارا نہیں ہوگا

ہر شعر ہے تصویر مرے زخمِ جگر کی
ہاں دیکھ کہ پھر ایسا نظارا نہیں ہوگا

تو سب کی سُنے ہے کبھی میری بھی غزل سُن
پھر ایسا خوش اسلوب دوبارا نہیں ہوگا

جس درد سے ہم تجھکو دیا کرتے ہیں آواز
بُلبُل نے بھی یوں گُل کو پُکارا نہیں ہوگا

کل ہوگی اگر آج پریشاں نہیں ہوگی
وہ زُلف جسے ہم نے سنوارا نہیں ہوگا

شمشیر کبھی وقت کی چل ہی نہیں سکتی
جب تک تری چتون کا اشارا نہیں ہوگا

جب ترکِ تعلق کا ستم جھیل چکے ہم
پھر کون سا غم ہے جو گوارا نہیں ہوگا

دُنیا میں مری جان کے دشمن تو بہت ہیں
تم جیسے ہو ایسا کوئی پیارا نہیں ہوگا

ہم کو کوئی اُمید زمانے سے نہیں ہے
جو تیرا ہوا ہے وہ ہمارا نہیں ہوگا

تمّت تمام



رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

راشٹریہ کوی گیان ودیا پیٹھ اوارڈ یافتہ ، بینک روڈ ، الٰہ آباد

کلکتہ
۱۶ر نومبر ۱۹۷۵ء

اے اہلِ ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو

میں اپنی زندگی کی اہم خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے جناب کلیم عاجز صاحب کا کلام خود اُنکے منہ سے سننے کے موقعے ملے، ابتک لوگوں کی شاعری پڑھ کر یا سنکر پسندیدگی اور کبھی کبھی قدر شناسی کے جذبات میرے اندر پیدا ہوتے رہے۔ لیکن جب میں نے کلیم عاجز صاحب کا کلام سُنا تو شاعر اور اسکے کلام پر مجھے ٹوٹکر پیار آیا ، اور ہم آہنگی ، محبت اور ناقابل برداشت خوشی کے جذبات میرے اندر پیدا ہوگئے۔ ان کا کلام مجھے اتنا پسند آیا کہ مجھے تکلیف سی ہونے لگی ، اور کلیم عاجز صاحب پہ غصہ آنے لگا کہ یہ کیوں اتنا اچھا کہتے ہیں ، انکے اس جرم اور قصور کیلئے میں انہیں کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ اتنی دھلی ہوئی زبان ، یہ گھلاوٹ ، اُف لہجے کا یہ جادو جو صرف انتہائی خلوص سے پیدا ہوسکتا ہے ، اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا ، میں اُن کا کلام سُنکر خود اپنا کلام بھول گیا ـــــــ کلیم عاجز صاحب اپنی شاعری اور اپنی آواز سے ہزاروں لاکھوں سننے والوں کا من موہ لیتے ہیں ، یہ ایک خطرناک خوبی ہے۔ رتھ سے راون نے جب لڑائی ٹھان لی تو یہی دُعا مانگی کہ مجھے رام کو دیکھ کر محبت نہ پیدا ہو جائے اس لئے کہ پھر میں ان سے کیسے لڑونگا ؟ کچھ ایسا ہی لبی گرن کلیم عاجز صاحب کی شاعری میں پایا جاتا ہے ، میں یہ جانتا ہوں کہ کلیم عاجز صاحب کی شاعری میں ہمیں مولانا رومی یا اقبال عرفی یا مرزا بیدل کے دقائق نہیں ڈھونڈنا چاہیئے ، لیکن صبح کے سہانے پن میں ، بھیروی کی راگنی میں چاندنی کے ناقابل بیان جادو میں ، ایک بچے میں کرشن کی ربوبیت کی جھلک میں ہم دقائق نہیں ڈھونڈتے گیتا کا فلسفہ نہیں ڈھونڈتے اور اس سے بھی کوئی بڑی چیز پالیتے ہیں ، وہی بے نام جادو ہمیں کلیم عاجز کی شاعری میں ملتا ہے۔ ٹھیٹ آدمیت یا آدمیت کے ٹھیٹ پن کی بلاغت کلیم عاجز کے شاعرانہ کردار میں نغمہ بن کر جھلک جایا کرتی ہے ـــــــ میں یہ سطور سخت بیماری کی حالت میں بول کر لکھوا رہا ہوں ، میں کلیم عاجز صاحب کی شاعری پر کچھ بھی کہتے ہوئے اپنے آنسو مشکل سے روک پاتا ہوں ـــــــ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا!

فراق

(فراق گورکھپوری)